جلد ۲۱ | و قد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین (القرآن) | شمارہ ۹

ماہنامہ

میثاق

لاہور

ستمبر ۱۹۷۴ء

اشاعت خصوصی

سر افگندیم !

بسم اللہ مجرھا و مرسھا

ان ربی لغفور الرحیم

★ مدیر مسؤل ★

ڈاکٹر اسرار احمد

ایم-بی-بی-ایس (پنجاب) - ایم-اے اسلامیات (کراچی)

★ مدیر معاون ★

مختار حسین فاروقی

بی-ایس-سی (انجینیرنگ)

★ یکے از مطبوعات ★

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۱۲- الغنی روڈ - سمن آباد - لاہور (فون : ۶۸۲۴۵)

چندہ سالانہ ۱۰/- ——— اس شمارے کی قیمت فی پرچہ ڈیڑھ روپیہ

بیثاق

دارُالاشاعت الاسلامیہ لاہور

کا مقصد

عُلومِ قرآنی کی عُمومی نشرواشاعت

ہے : تاکہ

① عوام کی توجّہات قرآن حکیم کی جانب مُنعطف ہوں، ذہنوں پر اُس کی عظمت کا نقش قائم ہو، دلوں میں اُس کی محبّت جاگزیں ہو ——— اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہو جائے۔

② بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے متعارف ہوں اور اُن میں سے کچھ تعداد ایسے نوجوانوں کی بھی نکل آئے جو اس کی قدر و قیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پوری زندگی اس کے علم و حکمت کی تحصیل اور نشرواشاعت کیلئے وقف کر دیں،

تاکہ

ایک عظیم الشان قرآن اکیڈمی کے قیام

کی راہ ہموار ہو سکے!

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

تقدیم

زیرِ نظر شمارے کی حیثیت ایک اشاعتِ خصوصی کی ہے اور یہ اصلاً راقم الحروف کی ایک تقریر پر مشتمل ہے جو ۱۲ جولائی کی شام کو لاہور میں قرآنی تربیت گاہ کے اختتام پر کی گئی تھی اور جس میں راقم نے اس فیصلے کا اعلان کیا تھا کہ یہ دعوتِ قرآنی اب جلد ہی ایک ہئیتِ تنظیمی کی صورت اختیار کرلے گی۔

تقریر کے بعض حصے چونکہ مزید تشریح و توضیح کے محتاج تھے لہٰذا تین ضمیموں کی صورت میں بعض ضروری اقتباسات شامل کر دیئے گئے ہیں۔

ان دونوں سے راقم کا **ماضی** آئینہ بن کر سامنے آگیا ہے۔ تقریر کا بقیہ حصہ مع مزید توضیحی اقتباسات آئندہ شمارے میں شائع ہوگا جس سے نہ صرف **حال** بلکہ **مستقبل کا لائحہ عمل** بھی واضح ہو جائے گا۔

بعض احباب نے اپنے خطوط میں جو مسائل اٹھائے تھے ان میں سے بھی اکثر کی وضاحت تو اس طرح آپ سے آپ ہو جائے گی۔ مزید کی ضرورت محسوس ہوئی تو ضرور عرض کیا جائے گا۔

خاکسار: **اسرار احمد** عفی عنہ

سرافگندیم!

بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا

[ایک تقریر جو اتوار ۱۲ جولائی کی شام کو قرآنی تربیت گاہ کے اختتامی اجلاس میں کی گئی تھی معمولی حذف و اضافے کے ساتھ ——— اسرار احمدؒ]

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَحْمَدُهٗ وَاَسْتَعِیْنُهٗ وَاَسْتَغْفِرُهٗ وَاُؤْمِنُ بِهٖ وَاَتَوَکَّلُ عَلَیْهِ وَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ نَفْسِیْ وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِیْ مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ یُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ!

حضرات!

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہمارا قرآنی تربیت گاہ کا پروگرام بخیر و خوبی اختتام کو پہنچا۔ اگرچہ اس بار ابتدا میں کچھ بددلی کا سامنا رہا تھا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اچانک کچھ انتظامی دشواریاں پیش آگئیں اور دوسرے موسم کی سختی اور خصوصاً برقی رو کی آنکھ مچولی کے باعث، تاہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کچھ تو رفتہ رفتہ انتظامات درست ہو گئے، کچھ آپ حضرات نے ع "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز!" کے مصداق موسم کے ساتھ سازگاری اختیار کر لی اور کچھ ہم نے پروگرام میں تخفیف

کرتے ہوئے ایک ماہ کے بجائے تین ہفتوں پر اکتفا کر لیا۔ بہرحال بفضل اللہ تعالیٰ دعوتی پروگرام پورا ہو گیا۔ گویا ع "شکر، صد شکر کہ خمازہ بمنزل رسید!"

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اس تربیت گاہ کے پروگراموں میں مرکزی حیثیت مطالعۂ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کے درس کو حاصل تھی جس کا آغاز یکم جولائی کو سورۂ والعصر سے ہوا تھا اور اختتام آج سورۂ حدید پر ہوا ہے اور جس کے بارے میں میں نے آغاز میں بھی عرض کر دیا تھا اور بعد میں بھی متعدد بار واضح کیا کہ اس کی ترتیب میں اصل مقصد یہ پیش نظر رہا ہے کہ ہمارے سامنے اللہ کے دین کا ایک صحیح، ہمہ گیر اور جامع تصور بھی آ جائے اور ہم پر اپنی اپنی ذمہ داریاں اور فرائض بھی منکشف ہو جائیں

گویا ہم پر یہ بھی واضح ہو جائے کہ ہمارا دین ہے کیا؟ اور یہ بھی منکشف ہو جائے کہ وہ ہم سے چاہتا کیا ہے؟!!!

اور آج اس نصاب کی تکمیل کے بعد، مجھے یقین ہے کہ آپ میرے ساتھ اتفاق فرمائیں گے کہ تربیتی پروگرام کے دوسرے حصوں میں چاہے کوئی کمی رہ گئی ہو، جہاں تک اس بنیادی مقصد کا تعلق ہے وہ بتمام و کمال نہ سہی ضروری حد تک بہرحال پورا ہو گیا ہے۔ اور ایک طرف تو یہ واضح ہو گیا ہے کہ ہمارا دین عام مذہبی تصورات کے مطابق صرف چند عقائد اور رسوم کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ پوری زندگی پر حکمرانی چاہتا ہے اور زندگی کے ہر ہر گوشے پر عمل داری کا طالب ہے اور اپنے ماننے والوں سے اس کا مطالبہ یہ ہے کہ اولاً وہ اسے خود اپنی زندگیوں میں بتمام و کمال رائج کریں اور پھر اسے ہیئت اجتماعیہ حقہ کو پورے کرۂ ارضی پر نافذ و غالب کرنے کی کوشش کریں اور اس میں تن من دھن سب کچھ کھپا دیں اور دوسری طرف اس نہ صرف محدود بلکہ مسخ شدہ (PERVERTED) تصور دین کی غلطی بھی پوری طرح واضح ہو گئی ہے جس نے امت مسلمہ کی عظیم اکثریت کے قویٰ شل کر دیئے ہیں اور اسے بحیثیت مجموعی جمود اور تعطل کا شکار بنا کر رکھ دیا ہے!

اب ظاہر ہے کہ اصل مسئلہ نیت اور ارادے کا ہے۔ مشہور کہاوت ہے کہ "سوتے کو جگایا جا سکتا ہے جاگتے کو جگانا ممکن نہیں!" اگر کوئی سمجھنے کا ارادہ ہی نہ رکھتا ہو تو بات دوسری ہے، لیکن اگر کوئی واقعتہً جاننا چاہے کہ از روئے قرآن انسان کی نجات کے ناگزیر لوازم کیا ہیں اور اللہ تعالیٰ کے یہاں فوز و فلاح سے ہمکنار ہونے اور عفو و درگزر کے مستحق قرار پانے کی کم از کم شرائط کیا ہیں تو اس کے لئے اجمالاً سورہ والعصر بھی کفایت کرتی ہے اور تفصیلاً یہ پورا نصاب تو حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے بعد اب اصل مسئلہ "عمل" کا ہے اور ظاہر ہے کہ یہی مرحلہ سب سے کٹھن ہے! اور اصل دشواری یہیں پیش آتی

ہے! اور یہی وہ معاملہ ہے جس سے متعلق اپنی زندگی کے ایک اہم فیصلے کے اظہار و اعلان اور اس کے پس منظر کی وضاحت کے لئے میں اس وقت آپ حضرات کے سامنے حاضر ہوا ہوں۔

اس سے پیشتر کہ میں وہ فیصلہ آپ حضرات کے سامنے رکھوں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ میرے اب تک کے کام کی نوعیت صرف درس و تدریس کی رہی ہے نہ کہ کسی ہمہ گیر دعوت کی اور میں یہ بات مسلسل واضح کرتا رہا ہوں کہ میری حیثیت اصلاً صرف ایک طالب علم کی اور زیادہ سے زیادہ ایک مدرس یا معلم کی ہے نہ کہ داعی یا مبلغ کی!

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات مبارکہ میں ایک جملہ آتا ہے۔ حضور فرمایا کرتے تھے "اُوْصِیْکُمْ وَ نَفْسِیْ بِتَقْوَی اللّٰہِ" یعنی میں تمہیں بھی تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں اور اپنے نفس کو بھی! میں اپنے لئے تو وصیت یا نصیحت کا لفظ بھی استعمال نہیں کرسکتا۔ میرے اب تک کے درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم قرآن کی نوعیت محض یہ رہی ہے کہ میرے نزدیک از روئے قرآن ہر مسلمان پر اس کے دین کی جانب سے یہ یہ ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ یہ میں آپ حضرات کو بھی بتا رہا ہوں اور خود اپنے آپ کو بھی! ہم سب حسب صلاحیت و استعداد ان پر مکلف بھی ہیں اور عند اللہ مسئول اور جوابدہ بھی! اور ہمیں ان سے عہدہ برآ ہونے کی فکر کرنی چاہیئے!

مجھے خوب معلوم تھا کہ یہ راہ یوں تو ویسے بھی بڑی کٹھن اور پر صعوبت ہے اور اس پر چلنے کے لئے "چیتے کا جگر چاہیئے شاہیں کا تجسس!" اس لئے کہ بفحوائے آیۂ قرآنی "اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ" بے شک یہ بہت ہمت کے کاموں میں سے ہے! لیکن اس میں پہل کرنے والا تو گویا ایک بہت ہی بھاری بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیتا ہے اور "اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ" اور "اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ" کہتے ہوئے اس پُرخطر وادی میں اتر جانا اور پھر پکارنا کہ "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ!" (کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں!) ہرگز کوئی آسان کام نہیں!

یہی وجہ ہے کہ تاحال میں "درس و تدریس" کے گوشہ عافیت ہی میں پناہ گزیں رہا اور میں نے یہی موقف اختیار کئے رکھا کہ دین کی یہ حقیقت ہے جو مطالعہ قرآن سے مجھ پر واضح ہوئی اور دین کے یہ فرائض ہیں جو کلام الٰہی سے مجھ پر منکشف ہوئے۔ میں اس کا مدعی نہیں کہ میں خود ان کو بجا لا رہا ہوں اور آپ کو دعوت دے رہا ہوں کہ ان کی ادائیگی میں میرے ساتھ شریک ہو جائیں۔ بلکہ مقصود محض اظہار حقیقت ہے اس خیال سے کہ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ میں سے کسی کو اس خدمت کے لئے قبول فرمائے اور سامعین میں سے کوئی با صلاحیت اور باہمت شخص ایسا نکل آئے جو اٹھ کھڑا ہو اور خلق خدا کو

دعوت دے کہ " اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہ " اللہ کے بندو میری طرف آؤ اور اس طرح راہ حق پر چلنے کے لئے ایک قافلہ تیار ہو جائے۔

لیکن اب بہت غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد محض اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق پر توکل و اعتماد اور صرف اسی کی امداد و اعانت کے سہارے اور بھروسے پر میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ میری زندگی میں یہ کام صرف درس و تدریس تک محدود نہیں رہے گا بلکہ انشاء اللہ العزیز احیائے اسلام اور غلبۂ دین حق ہی عملاً میری زندگی کا اصل مقصد ہوں گے اور میری بہتر اور بیشتر مساعی بالفعل دعوتِ دین اور خلق خدا پر دین حق کے جانب سے اتمام حجت میں صرف ہوں گی گویا " اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ " اور اسی کی دعوت میں اپنے تمام عزیزوں، دوستوں اور تمام جاننے والوں حتیٰ کہ بزرگوں تک کو دوں گا اور پھر جو لوگ اس راستے پر ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو جائیں انہیں ایک نظم میں منسلک کر کے ایک ہیئت اجتماعیہ تشکیل دوں گا جو ان مقاصد عالیہ کے لئے منظم جد و جہد کر سکے وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم !

میں نے یہ فیصلہ دفعتہً نہیں کر لیا ہے بلکہ اس کا ایک طویل پس منظر ہے اور چونکہ میں آپ حضرات کے سامنے اپنے آپ کو اس حیثیت سے پیش کرنے کا خواہش مند نہیں ہوں کہ جیسے یہ حقیقت بس مجھ ہی پر منکشف ہوئی ہے یا یہ کوئی "وحی" ہے جو براہ راست مجھ ہی پر "نازل" ہوئی ہے لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اجمالاً وہ پورا پس منظر آپ کے سامنے رکھ دوں تاکہ میرے فکر کا پورا "شجرۂ نسب" آپ کے علم میں آ جائے۔

اس سلسلے میں یہ معذرت پیشگی حاضر ہے کہ اس وقت میرے ذہن میں کوئی مرتب مواد موجود نہیں ہے آپ کو خوب معلوم ہے کہ یہ اکتیس دن مجھ پر کس قدر سخت مشقت کے گزرے ہیں۔ میری صحت پہلے

ہفتے کے بعد ہی جواب دے گئی تھی اور بعد میں پندرہ دنوں کے دوران میں میں نہایت ثقیل بلکہ مُضر ادویات کے سہارے اس فرض کو ادا کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں جو میں نے اپنے ذمے لے لیا تھا یعنی پورے منتخب نصاب کا درس، خصوصاً آج کا دن تو بہت سی سخت مشقت میں گزرا ہے۔ صبح کے ڈھائی گھنٹے اور عصر اور مغرب کے مابین ڈیڑھ گھنٹے کے درس کے بعد اب آپ مجھ سے کسی مرتب تقریر کی توقع بہر حال نہ رکھیں۔ اس وقت میرا اصل مقصد تو صرف اس فیصلے کا اظہار و اعلان تھا جو ہو گیا۔ جہاں تک اس کے پس منظر کا تعلق ہے تو اس میں سے جو جو چیزیں اس وقت ذہن میں بلا تکلف آ جائیں، اور جن جن کے جانب اللہ تعالیٰ ذہن کو منتقل فرما دیں انہیں بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے میری "بے ربطی تقریر" میں بھی "ربط محکم" پیدا فرما دے!

میں ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو مشرقی پنجاب کے ایک قصبے حصار میں پیدا ہوا اور گورنمنٹ ہائی سکول حصار ہی سے میں نے ۱۹۴۷ء میں پنجاب یونیورسٹی کا میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت میں پاس کیا۔ (میں نے کل ساڑھے آٹھ سو میں سے سات سو اٹھارہ نمبر لئے تھے اور یونیورسٹی میں چوتھی پوزیشن حاصل کی تھی!)

انسان کی عمر کے اس دور کا اکثر حصہ تو ظاہر ہے کہ خالص بے شعوری کی حالت میں گزرتا ہے اس کے آخری حصے کو بھی زیادہ سے زیادہ نیم شعوری کا زمانہ کہا جا سکتا ہے، تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں جو نقش لوحِ ذہن پر ثبت ہو جائیں وہ بہت گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔

میں نے اپنی زندگی کے بالکل ناسمجھی کے دور میں بھی چونکہ اس فضا میں سانس لیا جس میں ہندو مسلم کش مکش کے سائے گہرے ہونے شروع ہو چکے تھے اور مسلمانانِ ہند اپنے قومی تشخص کے تحفظ کے لئے جان توڑ کوشش پر مجبور ہو گئے تھے۔ لہٰذا میرے تحت الشعور کی سب سے نچلی سطح (SUBSTRATUM) میں مسلم قوم پرستی کا جذبہ رچ بس گیا یہاں تک کہ مجھے خوب یاد ہے کہ ۱۹۳۸ء میں جبکہ میری عمر کل چھ سال کی تھی میں نے علامہ اقبال مرحوم اور مصطفےٰ کمال پاشا کے انتقال کو نہ صرف ایک قومی نقصان بلکہ ذاتی صدمے کی حیثیت سے محسوس کیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ 'نیم شعوری' کے دور کے آغاز پر میرے ذہن نے اوّلیں اثرات علامہ اقبال مرحوم کی ملی شاعری سے قبول کئے۔ میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا جب میرے بڑے بھائی صاحب نے مجھے 'بانگِ درا' لا کر دی جسے میں گھنٹوں کچھ سمجھے اور کچھ بغیر سمجھے ترنم کے ساتھ پڑھتا رہتا تھا۔

بانگ درا کی نظموں میں سے مجھے سب سے زیادہ پسند وہ تھیں جن میں ملت اسلامی کے مستقبل کے بارے میں ایک امید افزا نقشہ کھینچا گیا تھا اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور اُمت مرحوم کی تجدید کی خوشخبری دی گئی تھی اور فی الجملہ یہ رنگ موجود تھا کہ ؎

اقبالؔ کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

خصوصاً طلوع اسلام کے یہ اشعار تو مجھے بے حد پسند تھے :

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیلؑ اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنّم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

اور ؎ سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا !

اور ان اشعار کو بھی میں بہت کیف اور سرور کے عالم میں پڑھا کرتا تھا ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا !

اور ـــــ نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا !

مولانا حالیؔ سے اس دور میں میں قطعاً متعارف نہ ہوا تھا لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ تاریخی اعتبار سے حالیؔ کی مسدس مسلمانانِ عالم کی پستی کی انتہا اور ملّت اسلامی کے زوال و انحطاط اور نکبت و ادبار کے نقطہ عروج سے مطابقت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار پر مایوسی اور دل شکستگی کی گہری چھاپ ہے اور ان کی شاعری تمام تر مرثیہ خوانی پر مشتمل ہے جیسے ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے

مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جذر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے !

اور اے خاصہ خاصانِ رسلؐ وقت دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

حالی اور اقبال ہمعصر بھی قرار دیئے جا سکتے ہیں اور تاریخ ہائے وفات کے اعتبار سے ان کے مابین ایک نسل کا فاصلہ بھی ہے اور اس 'وصل مع الفصل' اور 'جمع مع الفرق' کی کیفیت ان کے اشعار میں نظر آتی ہے یعنی جبکہ مولانا حالی کے اشعار صرف مرثیہ خوانی پر مشتمل ہیں وہاں اقبال کے یہاں ماضی پر حد درجہ زور دار مرثیہ خوانی بھی ہے (ملاحظہ ہوں 'بانگ درا' کی نظمیں 'صقلیہ' اور 'بلادِ اسلامیہ') اور مستقبل کے لئے نہایت جذبات انگیز اور جذبہ پرور حدی خوانی بھی!

بہرحال اپنی عمر کے نیم شعوری والے دور میں میرے ذہن پر اوّلیں چھاپ علامہ اقبال[1] کی ملی شاعری کی پڑی اور اس سے احیائے دین اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور ملت اسلامی کی تجدید اور تشکیل نو کا ایک جذبہ میرے قلب کی گہرائیوں میں رچ بس گیا۔

یہاں یہ اعتراف کرنا بھی مناسب ہے کہ اس جذبہ ملی کی آبیاری ایک زمانے میں حفیظ جالندھری صاحب

---

[1] یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پانچویں جماعت کے دوران 'بانگ درا' کو کچھ سمجھے اور کچھ بغیر سمجھے 'پی' جانے کے بعد میں نے چھٹی جماعت کے دوران 'بال جبریل' اور 'ضرب کلیم' کو ایک صاحب سے عاریتہً لے کر پڑھ ڈالا اور ساتویں جماعت کے زمانے میں ایک لطیف سا بہانہ بنا کر بڑے بھائی صاحب سے 'بال جبریل' 'ضرب کلیم' اور 'ارمغان حجاز' تینوں کتابیں حاصل کر لیں اور گویا علامہ مرحوم کا پورا اردو کلام نظر سے گزار لیا! 'ضرب کلیم' اور 'بال جبریل' کو عاریتہً حاصل کرنے کا واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ علامہ کی کتابوں کا مکمل سیٹ خان عزیز الدین کھرل کے یہاں موجود ہے جو حصار کے معروف وکلا میں سے تھے (اور اب بھی ملتان میں بقید حیات موجود ہیں) میں اپنے والد صاحب مرحوم و مغفور کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت وہ ایک عجیب سے کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گئے تھے کہ نہ انکار کئے بنتی تھی نہ طبیعت کتابیں دینے پر آمادہ ہوتی تھی۔ بالآخر انہوں نے ایک تدبیر سوچی اور علامہ کے ان اشعار کا مطلب مجھ سے دریافت کیا کہ ؎

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور!
الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور!

اور کہا کہ اگر ان اشعار کا مفہوم بیان کر دو تو کتابیں لے جا سکتے ہو۔ پھر جب میں نے ان کا مفہوم بیان کر دیا تو وہ کچھ حیران سے تو ہوئے تاہم انہوں نے کتابیں میرے حوالے کر دیں!

کے شاہنامہ اسلام سے بھی ہوتی مجھے یاد ہے کہ جن دنوں میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا میری ایک پوری رات شاہنامہ کی دوسری جلد کو اس کے مخصوص طرز ترنم میں پڑھ کر والدہ صاحبہ کو سنانے میں بسر ہوئی اس طرح کہ ادھر جلد ختم ہوئی اور ادھر صبح نمودار ہو گئی!

۴۶/۴۷ء کے دوران مسلمانان ہند کی قومی جد وجہد اپنے نقطہ عروج پر تھی اور پورے برصغیر کے مسلمانوں کے اعصاب پر تحریک مسلم لیگ کا کامل تسلط تھا۔ چنانچہ میں بھی اپنی اسی نیم شعوری کی کیفیت میں پوری تندہی کے ساتھ اس سے وابستہ تھا۔ اس زمانے میں میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا ایک فعال ورکر تھا اور اس دور میں ہمارے جذبہ ملی کے جوش و خروش کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہم فیڈریشن کے کارکن روزنامہ نوائے وقت کے استقبال کے لئے بالعموم ریلوے سٹیشن پہنچ جایا کرتے تھے کچھ عرصہ میں حصار ڈسٹرکٹ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکرٹری بھی رہا اور ۱۹۴۶ء میں ایک بار میں نے لاہور میں منعقدہ فیڈریشن کے ایک مرکزی اجلاس میں ضلع حصار کے نمائندے کی حیثیت سے بھی شرکت کی!

تحریک مسلم لیگ کے ساتھ اس عملی تعلق بلکہ انہماک کے ساتھ ساتھ اسی زمانے میں میں ایک نئی دعوت سے روشناس ہوا۔ یہ دعوت تھی موسس جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی کی! جس نے میرے جذبۂ ملی کو ایک نئی وسعت (DIMENSION) عطا کی اور دل میں تجدید و احیائے ملت کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی مقدم اور پیشتر "تجدید و احیائے دین" کا جذبہ پیدا کیا۔ یا یوں کہہ لیں کہ علامہ اقبال مرحوم کے عطا کردہ جذبۂ ملی کے خاکے میں ایک دینی فکر کا رنگ بھر دیا!

اپنے میٹرک کے زمانہ تعلیم کے دوران اگرچہ میں عملاً تحریک مسلم لیگ ہی سے وابستہ رہا اور یہ نیا دینی فکر مجھ پر اس درجہ غالب نہ آ سکا کہ میں عملاً بھی اسی کا ہو رہتا تاہم اس کا اثر مجھ پر اس حد تک ضرور ہوا کہ مسلم لیگ یا سٹوڈنٹس فیڈریشن کے حلقوں میں جب بھی مولانا مودودی یا جماعت اسلامی پر کوئی تنقید ہوتی یا طنز و طعن کا معاملہ ہوتا تو میں ان کی جانب سے مدافعت میں پورا زور صرف کر دیتا۔

اسی نئی دینی تحریک کے لٹریچر کے پڑھنے یا سمجھنے میں مجھے زیادہ دقت اس لئے نہ ہوئی کہ میں نے سکول میں اختیاری مضمون کی حیثیت سے عربی لی ہوئی تھی اور ایک تو ویسے بھی میرا شمار سکول کے ذہین اور ہوشیار طلبہ میں تھا اور دوسرے عربی سے مجھے اللہ تعالیٰ نے خصوصی شغف عطا فرما دیا تھا۔ چنانچہ جماعت کی بنیادی دعوت پر مشتمل چھوٹے کتابچے میں نے تمام کے تمام جناب مسرت مرزا صاحب اور چوہدری نذیر احمد صاحب (یہ دونوں حضرات اب ملتان میں مقیم ہیں!) سے حاصل کر کے پڑھ

ڈالے اور ایک حد تک سمجھ بھی لئے۔ میرے بھائی اظہار احمد صاحب ان دنوں جماعت کا لٹریچر گہرے انہماک کے ساتھ پڑھ رہے تھے یہاں تک کہ انہوں نے بہت سی کتابوں کے مفصل نوٹس (NOTES) بھی تیار کر لئے تھے!

۱۴ جولائی ۱۹۴۷ء کو میرا میٹرک کا نتیجہ نکلا۔ ۲۰ یا ۲۱ اگست کو عید الفطر تھی اور اس کے دوسرے ہی روز سے حصار میں مسلمانوں کے محلوں پر ہندوؤں کے منظم حملے شروع ہو گئے اور ستمبر کا پورا مہینہ ہم لوگوں نے محصوری کے عالم میں بسر کیا۔

اسی محصوری کی حالت میں میں تفہیم القرآن سے پہلی بار متعارف ہوا۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں میں اور میرے بڑے بھائی ہم دونوں محلے کی ایک مسجد میں ماہنامہ ترجمان القرآن کے تازہ پرچوں سے تفسیر سورۂ یوسف پڑھا کرتے تھے۔ عام فہم تو ظاہر ہے کہ ان کا زیادہ تھا، لیکن عربی میری بہتر تھی۔ اس طرح ہمارا اجتماعی مطالعہ بہت مفید بھی رہتا تھا اور دلچسپ بھی،

اور مجھے اس اعتراف میں ہرگز کوئی باک نہیں کہ میرے دل میں قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کی رغبت اوّلاً اسی کے ذریعے پیدا ہوئی بلکہ قرآن حکیم سے میرا اوّلیں تعارف اسی کی وساطت سے ہوا!

اپنے میٹرک کے ان دو سالوں کے دوران میرا تعارف ابو الکلام آزاد مرحوم کی تحریروں سے بھی ہوا۔ الہلال کے بعض پرانے پرچے بھی دیکھنے میں آئے اور کتابی صورت میں مطبوعہ 'مضامین الہلال' بھی میں نے پڑھے۔[1] اس سے یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی کہ جس تحریک کا علم اس وقت جماعت اسلامی

---

[1] مولانا ابو الکلام آزاد کی تصانیف کے حصول کا واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ حصار کے صنعتی سکول کے ایک انسٹرکٹر غلام محمد بھٹی صاحب کو کتابیں جمع کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا وہ خود ایک بہت ماہر جلد ساز تھے اور ان کے پاس نہایت اعلیٰ مجلّد کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ میں نے جب مولانا مرحوم کی تصانیف ان سے عاریۃً برائے مطالعہ مانگیں تو وہ بھی خان عزیز الدین حمزئی ہی کی طرح شش و پنج میں مبتلا ہو گئے اور انہوں نے بھی جان چھڑانے کی وہی تدبیر اختیار کی یعنی "مجموعہ مضامین الہلال" کھول کر ایک فارسی شعر جو سامنے آگیا اس کے معنی مجھ سے پوچھے۔ میں نے فارسی بالکل نہ پڑھی تھی۔ اس لئے پہلے تو ذرا جھجکا لیکن جب ذرا غور کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ تو اردو ہی کے الفاظ ہیں جو بس ذرا آگے پیچھے کر دیئے گئے ہیں چنانچہ میں نے معنی بیان کر دیئے اور کتاب حاصل کر لی!

کے ہاتھ میں ہے اور جو دعوت اس وقت مولانا مودودی پیش کر رہے ہیں، اس دور میں اس کے داعی اوّل کی حیثیت دراصل مولانا آزاد کو حاصل ہے۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کی کشمکش اور اس میں تلخی کی شدت کے باعث جو نفرت مولانا آزاد سے تھی وہ ختم ہو گئی اور اس کی جگہ ایک حسرت آمیز تاسف نے لے لی کہ اتنا عظیم کام چھوڑ کر وہ اب کن وادیوں میں سرگرداں ہیں اور دوسرا اور اہم تر نتیجہ یہ نکلا کہ میرے ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ اصل اہمیت اشخاص کی نہیں بلکہ مقاصد کی ہے اور نگاہیں شخصیتوں پر نہیں بلکہ کام پر مرتکز رہنی چاہئیں۔

[اکتوبر ۴۷ء کے اوائل میں انڈین ملٹری نے حصار میں ہماری قلعہ بندیاں زبردستی توڑ ڈالیں اور پوری مسلمان آبادی کو ایک نو تعمیر شدہ جیل کے احاطوں میں قائم شدہ کیمپ میں محبوس کر دیا۔ کچھ عرصہ وہاں قیام کے بعد ہم لوگ ایک پیدل قافلے کے ساتھ بیس روز میں ایک سو ستر میل کا فاصلہ طے کر کے اگر حافظہ غلطی نہیں کر رہا تو غالباً ۷ نومبر ۴۷ء کو براستہ سیلانکی ہیڈ ورکس پاکستان میں داخل ہوئے اور اس طرح زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا !]

پاکستان میں والد صاحب مرحوم و مغفور اوّل تو لاہور ہی میں تعینات ہوئے لیکن جلد ہی ان کا تبادلہ قصور کا ہو گیا اور میں ایف ایس سی (میڈیکل) کی تعلیم کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل اور محلہ کرشن نگر میں اپنے ایک عزیز کے مکان پر مقیم ہو گیا۔

ایف ایس سی کی تعلیم کے دو سالوں کے دوران میں نے حلقہ سمدر دان جماعت اسلامی سے باقاعدہ منسلک ہو کر بہت مستعدی اور جانفشانی کے ساتھ کام کیا۔ اس وقت کے خصوصی جوش و خروش میں بہت سے عوامل کو دخل حاصل تھا۔ ایک تو پاکستان کا قیام ہی کچھ کم جذبات انگیز واقعہ نہ تھا پھر جس قسم کے حالات میں سے گزر کر پاکستان پہنچنا نصیب ہوا تھا اس نے فوری طور پر ملی اور دینی جذبات کو بہت بھڑکا دیا تھا اور کچھ صورت حال بھی بظاہر ایسی نظر آتی تھی کہ جیسے اجیائے اسلام کی منزل بہت قریب ہے۔ قیام پاکستان سے گویا اصل مرحلہ تو طے ہو ہی گیا ہے اب کسر صرف اتنی ہے کہ اس میں اسلامی نظام قائم کر دیا جائے۔[1] پھر اسے بنیاد (BASE) بنا کر اسلام کے عالمی غلبے کی سعی و جہد بہت آسان ہو جائے گی۔ منزل کے اس قرب کے احساس نے آتش شوق کو مزید بھڑکا دیا تھا۔ ان حالات میں جب

---

[1] اس وقت یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ "عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است !"

جماعت اسلامی پاکستان میں "قیام نظام اسلامی" کی داعی بن کر سامنے آئی تو گویا اس نے جملہ قومی و ملی اور دینی و مذہبی جذبات کو اپیل کیا اور دوسرے بے شمار کارکنوں کی طرح میں بھی حد درجہ کیف و سرور کے عالم میں اس کی جد و جہد میں عملاً شریک ہو گیا۔

اسی زمانے میں میں نے جماعت کے لٹریچر کا بھی بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی کی تصانیف تو اس زمانے میں کچھ ثقیل اور کچھ روکھی اور پھیکی معلوم ہوتی تھیں لیکن مولانا مودودی کی تصانیف کا ایک ایک حرف نظر سے گزار لیا۔ بایں ہمہ میں تحریک اسلامی کے ساتھ اپنے اس دور کے تعلق کو بھی شعوری نہیں، نیم شعوری قرار دیتا ہوں۔

اواخر ۴۹ء میں میں میڈیکل کالج لاہور میں داخل ہوا اور ساتھ ہی میری رہائش بھی ہاسٹل میں منتقل ہو گئی نتیجۃً تنظیمی اعتبار سے میرا تعلق جماعت اسلامی سے منقطع اور اسلامی جمعیت طلبہ سے قائم ہو گیا۔

۵۰ء میں میں نے جمعیت کی رکنیت اختیار کی اور فوراً ہی نظامت حلقہ میڈیکل کالج کا بوجھ میرے کاندھوں پر ڈال دیا گیا ۵۱ء میں میں جمعیت لاہور کا ناظم بھی بنا دیا گیا اور جمعیت پنجاب کا بھی اور ۵۲ء میں میں جمعیت کا ناظم اعلیٰ منتخب ہو گیا ——— واضح رہے کہ میں ان 'مناصب' کا ذکر کسی احساس فخر کے تحت نہیں کر رہا ہوں بلکہ صرف اس حقیقت کے اظہار کے لئے کر رہا ہوں کہ اس دور میں میں نے انتہائی جوش و خروش اور حد درجہ انہماک کے ساتھ اور تحریک کے تقاضوں کو دوسری ہر چیز پر مقدم جان کر کام کیا۔ یہاں تک کہ اپنی تعلیم کے نقصان[1] اور اپنے پیشہ ورانہ مستقبل (PROFESSIONAL CAREER) کی تباہی کی بھی کوئی پرواہ نہ کی گویا ؎

خیریتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی!

یہاں کوئی صاحب یہ گمان نہ فرمائیں کہ مجھے اس پر کوئی پشیمانی یا پچھتاوا ہے، حقیقت اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ اپنی زندگی کا وہ دور مجھے انتہائی عزیز ہے اور اس کی یاد کو میں اب بھی اپنی ایک قیمتی متاع سمجھتا ہوں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آج دین کی جس خدمت کی توفیق مجھے بارگاہ خداوندی سے ملی ہوئی ہے

---

[1] یہ تو مجھ پر اللہ کا فضل رہا کہ میرا پورا تعلیمی کیریر کسی امتحان میں فیل ہونے کے داغ سے بچا رہا تاہم پرائمری، مڈل، میٹرک، ایف ایس سی اور میڈیکل کالج کے فرسٹ ایر کے امتحانات میں جو شاندار کامیابیاں میں نے حاصل کیں وہ بعد میں برقرار نہ رہیں!

اُس کی اساس اور بنیاد اسی دور میں قائم ہوئی تھی گویا میرا معاملہ تو وہ ہے کہ :

اس عشق، نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت!

چنانچہ تحریر و تقریر کی جو بھی تھوڑی بہت صلاحیت آج مجھ میں ہے وہ اسی دور میں ابھری اور پروان چڑھی اور اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ بطور زبان مجھے اردو پر نہ اُس وقت کوئی عبور حاصل تھا نہ اب حاصل ہے تاہم ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اظہار فی الضمیر کی جو بھی تھوڑی بہت استعداد مجھے حاصل ہے اس کی اوّلیں تربیت جمعیت طلبہ کے ہفتہ وار آرگن "عزم" کی ادارت ہی سے حاصل ہوئی تھی۔ اسی طرح کوئی شعلہ بیان خطیب یا جادو اثر مقرر تو میں نہ اس وقت تھا نہ آج ہوں تاہم تقریر و بیان کی جو بھی تھوڑی بہت صلاحیت مجھ میں موجود ہے وہ تمام تر اسی دور کی مرہون منت ہے۔

جہاں تک مولانا مودودی کی تصانیف کا تعلق ہے ان کا تو میں اس دور میں "متعلّم" ہی نہیں "معلّم" بن گیا تھا خصوصاً ان کی جو تحریریں تحریک جماعت اسلامی کے اصول و مبادی اور اس کے مختلف ادوار سے متعلق تھیں ان کا تو ایک حد تک "حافظ" ہو گیا تھا چنانچہ اس تحریک کی امتیازی خصوصیات اور اس کے مخصوص طریق کار کے بارے میں اس دور میں میرا ذہن بالکل صاف ہو چکا تھا اور اس میں کوئی ابہام نہ رہا تھا۔

مزید برآں اس دور میں مجھ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم یہ ہوا کہ مجھے اوّلاً مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تصانیف اور پھر ان کی وساطت سے قرآن حکیم کے ساتھ ایک ذہنی مناسبت پیدا ہو گئی۔ مولانا کی تصانیف میں سے خصوصاً "دعوت دین اور اس کا طریق کار" سے مجھے عشق کی حد تک قلبی تعلق پیدا ہو گیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اسی کتاب کے ذریعے مجھ پر تحریک اسلامی کا "دینی فکر" واضح ہوا اور فریضہ تبلیغ و شہادت حق کی اصل اہمیت منکشف ہوئی۔ پھر جب مولانا کی ایک دوسری تالیف "تدبّر قرآن" کے نام سے شائع ہوئی تو اس کا مطالعہ بھی میں نے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ کیا اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم کے ساتھ ایک پختہ ذہنی مناسبت اور محکم قلبی اُنس کی بنیاد اس کتاب سے قائم ہوئی۔

دسمبر ۵۱ء کی کرسمس اور جولائی ۵۲ء کی موسم گرما کی تعطیلات میں میں نے لاہور میں "تربیتی کیمپ" منعقد کئے جن میں قرآن حکیم کے چند منتخب مقامات کا درس مولانا اصلاحی نے دیا۔ میں خود ان دونوں کیمپوں میں بحیثیت ناظم شریک تھا چنانچہ میں نے ان سے بھرپور استفادہ کیا اور واقعہ یہ ہے کہ ان

سے نہ صرف یہ کہ میرے قرآن حکیم کے ساتھ ذہنی و قلبی تعلق میں اضافہ ہوا بلکہ میری طبیعت میں تعلیم و تعلّم قرآن کا داعیہ شدّت کے ساتھ بیدار ہو گیا۔

قرآن حکیم کے ساتھ اس ذہنی و قلبی مناسبت اور اس قوتِ گویائی اور صلاحیتِ بیان نے جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں، مل جل کر مجھے انہی زمانے میں 'مدرّس قرآن' بنا دیا چنانچہ جمعیت کے اجتماعات میں بھی 'درس قرآن' کی ذمہ داری اکثر و بیشتر مجھی پر رہتی تھی اور تعطیلات کے زمانے میں جب میں گھر آتا تھا (اس وقت تک والد صاحب مرحوم منٹگمری حال ساہی وال میں اقامت اختیار فرما چکے تھے) تو جماعت اسلامی کے اجتماعات میں بھی درس قرآن کی فرمائش مجھ ہی سے کی جاتی تھی اور میرا درس بالعموم پسند کیا جاتا تھا۔[1]

قرآن حکیم کے ساتھ اس تعلق کا سب سے بڑا فائدہ جو مجھے پہنچا وہ یہ کہ دین کی اساسی تعلیمات بھی مجھ پر براہ راست قرآن حکیم کی روشنی میں واضح ہو گئیں اور خاص طور پر دعوت و تبلیغ دین کی اہمیت اور شہادت حق اور اقامتِ دین کی فرضیت بھی مجھ پر از روئے قرآن منکشف ہو گئی گویا "فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى" کے مصداق میرے دینی فکر کا ایک براہ راست تعلق قرآن حکیم سے قائم ہو گیا۔

اس کی اہمیت کا اندازہ مجھے اس وقت تو نہ تھا لیکن بعد میں اس کا احساس مجھے شدّت کے ساتھ ہوا کہ اگر خدانخواستہ اُس وقت اس پہلو سے کوئی کمی رہ جاتی تو بعد میں جب بعض شخصیتوں سے میرا عقیدت

---

[1] ۵۳ء میں جمعیت کے سالانہ اجتماع کے موقع پر جو درس سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی ابتدائی آیات کا میں نے دیا تھا اُس کا ذکر تقریباً بیس سال بعد ۷۳ء میں کراچی کے ایک سفر کے دوران میرے سامنے بہت عجیب طریقے سے آیا۔ ریل میں ایک ہمسفر سے گفتگو ہو رہی تھی جس میں تعلیم و تعلّم قرآن کی اہمیت کا ذکر چل نکلا۔ اس پر ان صاحب نے عجیب کیفیت کے ساتھ کہا کہ "صاحب! ایک درس ۵۳ء میں ہم نے سنا تھا اس کی حلاوت کا احساس ابھی تک باقی ہے!" میں نے ذرا کریدا تو معلوم ہوا کہ در اصل میرے ہی درس کا ذکر ہے۔ چنانچہ میں نے بات وہیں ختم کر دی اور اپنا مزید تعارف مناسب نہ سمجھا! اسی طرح ۵۴ء میں ملتان میں منعقدہ جمعیت کی تربیت گاہ میں مولانا اصلاحی سے پڑھے ہوئے مقامات کا جو درس میں نے دیا تھا اس کا ذکر بہت سے احباب آج بھی کرتے ہیں۔ فللّٰہ الحمد والمنۃ۔

کا رشتہ کمزور پڑا، یہاں تک کہ بالکل منقطع بھی ہو گیا اور جمعیت اور جماعت دونوں سے تنظیمی رشتہ بھی ختم ہو گیا تو اس حکمہ کا پورا تانا بانا بھی درہم برہم ہو جاتا اور میں بھی ان بہت سے لوگوں کے مانند ہو جاتا جو جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوتے تو ان کا تعلق نہ صرف تحریک اسلامی بلکہ بعض افسوس ناک مثالوں کے اعتبار سے تو گویا اسلام ہی سے منقطع ہو گیا۔

الغرض جمعیت طلبہ سے تعلق کا زمانہ میری زندگی کا اہم ترین دور ہے جس میں خود دین و مذہب کے ساتھ بھی میرا صحیح فکری تعلق قائم ہوا اور تحریک تجدید و احیائے دین کے ساتھ بھی میرے حقیقی اور شعوری تعلق کا آغاز ہوا[1] اور احیائے اسلام اور تجدید ملت کا وہ جذبہ جو بچپن میں علامہ اقبال مرحوم کی شاعری سے پیدا ہوا تھا اور جس میں ایک دینی فکر کا پیوند ابتداءً مولانا مودودی کی تحریروں سے لگا تھا بالآخر مولانا اصلاحی کی تصانیف کی وساطت سے قرآن حکیم کی محکم اساس پر استوار ہو گیا۔ الحمدُ للّٰہِ الذی ھدانا لھٰذا وما کنّا لنھتدی لولا ان ھدانا اللّٰہ۔

۱۹۵۴ء میں میں نے ایم بی بی ایس کا آخری امتحان پاس کیا اور جیسے ہی میرا نتیجہ نکلا میں نے اسلامی جمعیت طلبہ کی رکنیت سے استعفاء دے دیا اور جماعت اسلامی کی رکنیت کی درخواست داخل کر دی اس لئے کہ میرے سامنے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مبارک تھا کہ " اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ : الجماعۃِ والسّمعِ والطّاعۃِ والھجرۃِ والجھادِ فی سبیل اللّٰہ " (مشکوٰۃ شریف : عن حارث الاشعریؓ) اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میری زندگی میں چند دن بھی بغیر جماعت کے بسر ہوں۔

لیکن افسوس کہ جماعت اسلامی میں میرا قیام بہت مختصر رہا۔

رکن کی حیثیت سے جماعت میں شامل ہوتے ہی پہلی بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ دینی

---

[1] اس دور میں اللہ کے دین کی بنیادی دعوت اور مسلمانوں کے دینی فرائض اور اہل ایمان سے اللہ کے دین کے تقاضوں اور مطالبوں کا جو تصور میرے ذہن میں راسخ ہوا تھا اس کے بارے میں اب کچھ کہنے سننے کے بجائے میں اپنی اسی دور کی بعض تحریروں اور تقریروں سے کچھ اقتباسات (ضمیمہ اول) میں درج کر رہا ہوں تاکہ یہ نہ کہا جا سکے کہ یہ سب بعد کی خیال آرائیاں ہیں!

اور اخلاقی اعتبار سے جماعت پر شدید انحطاط اور اضمحلال طاری ہوچکا ہے اور اس کے منتسبین میں کسی انقلابی تحریک کے بجائے عام سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کا سا مزاج پیدا ہوگیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوا کہ جماعت کی دعوت اور اس کی اپیل کا رخ بھی اب وہ نہیں رہا جو آغاز میں تھا بلکہ اس میں بھی ایک عام سیاسی جماعت کا سا انداز پیدا ہوچکا ہے۔

میرے ذہن نے جب اس قلب ماہیت کے اسباب و عوامل پر غور کرنا شروع کیا تو ساتھ ہی ایک اور سوال جو ابھر کر سامنے آکھڑا ہوا وہ یہ تھا کہ ۴۷ء میں پاکستان میں نظام اسلامی کا قیام جو اس قدر آسان اور بالکل قریب نظر آ رہا تھا وہ آٹھ سالہ جد و جہد کے باوجود روز بروز نگاہوں سے دُور تر کیوں ہوتا چلا جا رہا ہے؟

جیسے جیسے میں ان مسائل پر غور کرتا گیا مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوتی چلی گئی کہ تحریک جماعت اسلامی اپنے اصل رخ سے بھٹک گئی ہے اور ۴۷ء میں ملک کے بدلے ہوئے حالات میں 'مواقع' اور 'امکانات' کے 'دام ہمرنگِ زمین' میں گرفتار ہوکر جماعت اسلامی کی قیادت نے طریق کار میں جو تبدیلی کی تھی اس نے اس تحریک کی ساری بلند پروازی کو ختم کرکے رکھ دیا ہے اور اب جماعت کا اصولی، اسلامی، انقلابی، کردار تو ع "خورشش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود"! کے مصداق داستان پارینہ بن چکا ہے البتہ ایک 'اسلام پسند، قومی، سیاسی، پارٹی کی حیثیت سے جماعت کا وجود باقی ہے!

ابتدا میں یہ انکشاف میرے لئے حد درجہ اذیت بخش تھا اور مجھ پر شدید رنج و غم اور مایوسی کا غلبہ ہوگیا تھا مگر جیسے جیسے اس مسئلے کے دوسرے پہلو واضح ہوتے گئے اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ جماعت کی اس تبدیلی کو محسوس کرنے والا میں تنہا ہی نہیں ہوں بلکہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں جن میں ایک اچھی بھلی تعداد اس کے 'اکابر' کی بھی ہے تو ذرا ہمت بندھی کہ غلطی کا ازالہ ممکن ہے اور ذرا کوشش کی جائے تو اس تحریک کو دوبارہ اپنے اصل رخ پر ڈالا جا سکتا ہے۔

اسی امید پر میں نے ڈھائی صد صفحات پر پھیلی ہوئی ایک تحریر کے ذریعے جماعت اسلامی کے قبل از تقسیم ہند موقف اور طریق کار، اور بعد از تقسیم پالیسی کے تفاوت اور تضاد کو واضح کیا اور جماعت کے ارباب حل و عقد سے اپیل کی کہ وہ نئے طریق کار کو ترک کرکے سابق طریق کار ہی کی جانب رجوع کریں!

میری یہ تحریر اب "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے مطبوعہ موجود ہے اور اس موضوع پر میں اس وقت مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا سوائے اس کے کہ میں نے یہ تحریر ۱۹۵۶ء میں لکھی تھی اور

اب ۷۴ء ہے، لیکن اٹھارہ سال گزر جانے کے بعد بھی میں اسے اتنا ہی صحیح سمجھتا ہوں جتنا اس وقت سمجھتا تھا اور میرے موقف میں سرمو فرق واقع نہیں ہوا ہے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں پختگی ہی پیدا ہوتی چلی گئی ہے!

لیکن افسوس کہ جماعت اسلامی میں یہ اختلاف رائے انتہائی ہنگامہ خیز بن گیا اور اواخر ۵۶ء اور اوائل ۵۷ء کا تقریباً چھ ماہ کا عرصہ جماعت اسلامی پاکستان پر ایک سخت بحرانی کیفیت میں گزرا۔ جس کے نتیجے میں کم و بیش ستر اسّی ارکان جماعت سے علیحدہ ہو گئے جن میں مجھ ایسے عام کارکنوں کے ساتھ ساتھ مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالجبّار غازی، مولانا عبدالغفار حسن، مولانا عبدالرحیم اشرف، شیخ سلطان احمد، سردار اجمل خان لغاری ایسے اکابر بھی شامل تھے اور گویا جماعت کی قیادت کی پوری صفِ دوم جماعت سے کٹ گئی تھی۔

یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوا اور اس کی اصل ذمّہ داری کس پر ہے؟ یہ ایک بڑی تلخ داستان ہے جس کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے۔ تاہم میں نے آیۂ مبارکہ " وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا "[1] کے حوالے سے "نقضِ غزل" کے عنوان کے تحت اس کے اہم حصے سپردِ قلم کر دیئے تھے جو حضرات دلچسپی رکھتے ہوں ان کا مطالعہ کر لیں[2]

میں نے جماعت کی رکنیت کی درخواست ۱۵ر نومبر ۵۴ء کو تحریر کی تھی اور تقریباً ڈھائی سال بعد اپریل ۵۷ء کی کسی تاریخ کو میں نے انتہائی بوجھل دل کے ساتھ جماعت کی رکنیت سے استعفا تحریر کر دیا[3]

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ میں نے زندگی کا وہ نصب العین بھی ترک کر دیا جس کے حصول کے لئے میں نے جماعت میں شمولیت اختیار کی تھی اور احیائے اسلام و تجدید دین اور شہادت حق و اقامتِ دین کی اُس جد و جہد سے بھی لاتعلقی اختیار کر لی جسے میں

---

[1] سورۂ نحل: آیت ۹۲: "نہ بن جاؤ اس بڑھیا کے مانند جس نے سوت کاتنے کے بعد اسے ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھ دیا"

[2] یہ داستان ۶۶ء اور ۶۷ء کے دوران میں ماہنامہ "میثاق" لاہور میں بالاقساط شائع ہوتی تھی۔ ابھی ۶۶ء/۶۷ء کے چند فائل دفتر میں موجود ہیں جو صاحب چاہیں طلب فرما لیں۔

[3] اسی شمارے میں ضمیمہ دوم میں درخواست رکنیت اور تحریر استعفا دونوں شامل کئے جا رہے ہیں۔

نے پورے شعور و ادراک کے ساتھ اپنا دینی فرض سمجھ کر قبول کیا تھا۔

اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ بحمد اللہ، گزشتہ سترہ اٹھارہ سالوں کے دوران میں مجھ پر کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ میری نگاہوں سے احیائے اسلام اور اقامت دین کا بلند و بالا نصب العین اوجھل ہوا ہو یا مجھے اپنے ان فرائض کے بارے میں کوئی شک یا شبہ لاحق ہوا ہو۔ سبب اس کا پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔ یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرا تعلق پہلے ہی اشخاص سے نہیں بلکہ قرآن حکیم سے قائم ہو چکا تھا اور یہ بات مجھ پر از روئے قرآن منکشف ہو چکی تھی کہ شہادتِ حق میری ذمہ داری اور اقامتِ دین میرا فرض ہے۔ اگر کوئی جماعت ایسی موجود ہو جس میں انشراحِ صدر کے ساتھ شریک ہو کر اپنے ان فرائض کو ادا کر سکوں تو فبہا، اس جماعت کا وجود میرے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تب بھی فرض تو ساقط نہیں ہو جاتا، اگرچہ کام کٹھن ضرور ہو جاتا ہے یعنی یہ کہ انسان از خود کھڑا ہو اور اپنے دینی فرائض کی ادائیگی کے لئے دوسروں کو دعوت دے اور ایک جماعت تشکیل دے کر ان فرائض سے عہدہ برآ ہو یا بصورت آخر کم از کم اپنی ذاتی حیثیت میں تن تنہا کوشاں رہے۔

اشخاص آئیں گے اور چلے جائیں گے۔ جماعتیں بنیں گی اور منتشر ہو جائیں گی لیکن اللہ کا دین بھی دائم و قائم رہے گا اور اس کی کتاب بھی! انسان کا فرض یہ ہے کہ فرمان نبوی قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا إِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوا أَبَدًا كِتَابَ اللهِ[1] کے مصداق قرآن ہی کو اپنا رہنما اور ہادی و امام بنائے اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہے اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے دین کی کسی خدمت کی توفیق مرحمت فرما دے تو اسے سراسر اسی کا فضل و کرم اور انعام و احسان سمجھے گویا: ؎

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی!
منت شناس از او کہ بخدمت گزاشتت!

جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد ابتداءً قوی امید تھی کہ علیحدہ ہونے والے حضرات ایک نئی

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کا ایک فقرہ: "میں چھوڑ چلا ہوں تمہارے مابین وہ چیز کہ اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھام لیا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ یعنی کتاب اللہ!"

تنظیمی ہیئت تشکیل دے کر جماعت کے سابق طریقِ کار کے طرز پر عملی جدّ و جہد شروع کر دیں گے اور یہ امید ہرگز بے بنیاد نہ تھی اس لئے کہ علیحدہ ہونے والوں میں نہ اہلِ علم کی کمی تھی نہ اصحابِ فضل کی، اور ان میں چار حضرات وہ بھی تھے جن کے کاندھوں پر مولانا مودودی کی اسیری و نظر بندی کے مختلف مواقع پر جماعت کی امارت کا بوجھ آ چکا تھا گویا تنظیمی اعتبار سے بھی جماعت میں ان کا مقام بلند رہا تھا!

یہی وجہ ہے کہ ابتدائی دو سال یعنی وسط ۵۷ء سے وسط ۵۹ء کا عرصہ اس حال میں بیتا کہ آج لاہور کا سفر ہے تو کل لائل پور کا اور ابھی رحیم آباد سے لوٹا ہوں تو سکھر کے لئے رختِ سفر باندھ رہا ہوں، وقس علیٰ ہذا۔ یہاں تک کہ ایک بار یعنی دسمبر ۵۸ء میں تو ساہیوال میں اپنا مطب بند کر کے اہل و عیال سمیت کراچی منتقل ہو گیا۔ اگرچہ وہاں سے چھ یا سات ماہ بعد ہی والد صاحب مرحوم کی علالت کے باعث لوٹ آنا پڑا۔

اس دوران میں متعدد اہم مشاورتی اجلاس بھی منعقد ہوئے جن میں سب سے بڑا خود میرے زیرِ اہتمام عزیزیہ ہائی سکول میں منعقد ہوا تھا جس میں تقریباً تمام اہم لوگ شریک ہوئے اور جو غالباً تین روز تک جاری رہا۔

لیکن افسوس کہ یہ ساری بھاگ دوڑ بے نتیجہ رہی اور مختلف اسباب[1] کی بنا پر جماعت سے علیحدہ ہونے والے حضرات کسی نئی ہیئت اجتماعیہ کے قیام پر متفق نہ ہو سکے اور رفتہ رفتہ سب نے اپنے اپنے ذوق اور مزاج طبع کی مناسبت سے انفرادی طور پر مختلف تعمیری سرگرمیوں کا آغاز کر دیا جو تقریباً سب کی سب علمی و تعلیمی نوعیت کی تھیں۔ مثلاً مولانا اصلاحی صاحب نے لاہور میں حلقہ تدبرِ قرآن قائم کر لیا، ماہنامہ "میثاق" جاری فرمایا اور تفسیر تدبرِ قرآن کی تسوید کا آغاز کر دیا۔ حکیم عبد الرحیم اشرف نے لائل پور میں "جامعہ تعلیمات اسلامیہ" قائم کر لیا اور ہفت روزہ "المنبر" پر محنت شروع کر دی۔ مولانا عبد الغفار حسن ابتداءً ان کے شریکِ کار رہے اور بعد میں میرے ساتھ اشتراکِ عمل کے لئے ساہیوال منتقل ہو گئے۔ مولانا عبد الجبار غازی نے راولپنڈی میں ایک ہائی سکول قائم کیا اور وہ

[1] یہاں ان اسباب کی تفصیل میں جانا لاحاصل ہے۔ ویسے میں نے میثاق کے اگست ۶۶ء اور ۶۷ء کے شماروں میں اس موضوع پر اختصار کے ساتھ اظہارِ خیال کیا تھا۔ جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہاں ملاحظہ فرمائیں!

اس کی تعمیر و ترقی میں ہمہ تن منہمک ہو گئے۔ سردار اجمل خاں لغاری نے "ادارہ اجمل باغ" کے نام سے جامعہ ملیہ دہلی کے طرز پر ایک ادارہ قائم کر لیا۔ وقس علیٰ ہذا۔

میں نے بھی وسط ۵۹ء میں کراچی سے واپس ساہیوال آکر دو کاموں کا آغاز کر دیا۔ یعنی ایک حلقۂ مطالعہ قرآن اور دوسرے کالج میں زیر تعلیم طلبہ کی دینی تعلیم و تربیت کے لئے ایک ہاسٹل کا قیام۔[1] ان دونوں سے مقصود ایک ہی تھا یعنی مقدم الذکر کے ذریعے عوام میں اور موخر الذکر کے ذریعے کالج کے طلبہ میں قرآن حکیم سے ایک قلبی لگاؤ اور ذہنی تعلق پیدا کرنے کی کوشش۔ اس غرض کے لئے میں نے ان مقامات پر بعض اضافے کرکے جو میں نے مولانا اصلاحی صاحب سے پڑھے تھے ایک قدرے وسیع تر منتخب نصاب مرتب کیا اور اس کا درس دیا۔

تقریباً ڈھائی برس (یعنی اواخر ۶۱ء تک) میں ساہیوال میں اپنے مطب کے ساتھ ساتھ ان دونوں کاموں میں پورے انہماک کے ساتھ مشغول رہا۔

اوائل ۶۲ء میں بڑے بھائی صاحب کی طرف سے دین اور دنیا یعنی معاش اور معاد دونوں کے لئے مشترکہ کوشش کی ایک نہایت دلآویز اور خوش آئند تجویز کے تحت، میں کراچی منتقل ہو گیا اور اگرچہ بہت جلد محسوس ہو گیا یہ بھی ایک "دام ہمرنگ زمیں" ہی ہے۔ تاہم ایک دفعہ اس میں گرفتار ہونے کے بعد کم و بیش تین سال اس سے رہائی حاصل کرنے میں لگے اور ۶۵ء میں میں واپس ساہیوال آسکا!

کراچی کے اس قیام کے دوران میں بھی میرا جنون بالکل بیکار نہ بیٹھ سکا۔ چنانچہ وہاں بھی میں نے مقبول عام ہائی سکول میں ایک "حلقۂ مطالعۂ قرآن" قائم کیا جس کے ہفتہ وار اجتماعات میں میں اسی منتخب نصاب کا درس دیتا رہا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے! دوسرے اس زمانے میں میں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کا امتحان بھی پاس کر لیا جس میں اتفاقاً میں یونیورسٹی میں اوّل بھی آگیا!

ساہیوال اور کراچی میں قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے درس سے کسی اور کو کوئی نفع پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو کم از کم مجھے ضرور یہ فائدہ

[1] ان دونوں کاموں کے بارے میں ایک مفصل تعارفی نوٹ مولانا امین احسن اصلاحی نے میثاق بابت مئی ۶۱ء کے ادارتی صفحات میں رقم فرمایا تھا جس سے مختصر اقتباس سال رواں کی اشاعت اوّل میں دیا جا چکا ہے!

پہنچی کہ تحریک اسلامی سے مسلسل آٹھ نو سال تک تنظیمی اعتبار سے لاتعلق رہنے کے باوجود اس کی اساسی دعوت سے بھی میرا ذہنی اور قلبی تعلق برقرار رہا اور اپنے دینی فرائض کے احساس اور ذمہ داریوں کے شعور سے بھی میرا ذہن فارغ نہ ہو سکا گویا مجھے اپنا سبق یاد رہا اور میری حالت اس شعر کے مصداق رہی کہ ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا!

کراچی سے واپس ساہیوال آکر میں ابھی اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ۱۱ نومبر ۶۵ء کو والد صاحب انتقال فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نتیجۃً سرزمین ساہیوال سے جو ایک محکم رشتہ ان کی وجہ سے قائم تھا وہ ختم ہو گیا۔ ادھر دو بار نقل مکانی کے بعد اب از سرِ نو ساہیوال میں پریکٹس شروع کرنے میں بھی کچھ حجاب سا محسوس ہوتا تھا۔ سلبی طور پر ان دو عوامل اور اثباتی طور پر اس خیال نے کہ 'مقصدِ زندگی' کے اعتبار سے سرزمین لاہور ہی میں کسی کام کا آغاز مناسب ہوگا، مجھے اوائل ۶۶ء میں ساہیوال سے لاہور لا بٹھایا اور اس طرح زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا!

لاہور میں میرا اوّلیں پروگرام یہ تھا کہ میں 'حلقہ تدبر قرآن' میں شامل ہو کر مولانا اصلاحی کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہہ کروں گا اور عربی کی تکمیل بھی کروں گا اور علم قرآن کی تحصیل بھی۔ لیکن کچھ عرصہ حلقے میں شرکت کرنے کے بعد میں نے بھی محسوس کیا کہ مولانا پر پچھلے گروپ پر محنت کے نتائج کے پیشِ نظر کچھ تکان سی طاری ہو چکی ہے اور اب وہ دوبارہ اس نوعیت کی محنت پر آمادہ نہیں ہیں اور خود مولانا نے بھی واضح الفاظ میں یہ بات فرما دی۔ نتیجۃً میرا یہ ارادہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

اب جو آئندہ کے پروگرام کے بارے میں غور کیا تو وہ چنگاری پھر پوری شدت کے ساتھ بھڑک اٹھی جو گزشتہ آٹھ نو سالوں کے دوران بھی ع "آگ بجھی ہوئی نہ جان آگ دبی ہوئی سمجھ!" کے مصداق سلگتی رہی تھی چنانچہ نگاہیں دو کاموں پر مرتکز ہو گئیں۔ ایک یہ کہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے سابق رفقاء میں سے زیادہ سے زیادہ جتنے لوگ ذہنی یکسوئی اور فکری یک جہتی کے ساتھ

جمع ہو سکیں انہیں ایک نظم میں منسلک کیا جائے تاکہ عمومی دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تربیت کا کام منظم طریق پر کیا جا سکے اور فریضہ شہادت حق اور اقامت دین کے لئے اجتماعی جد و جہد دوبارہ انہی خطوط پر شروع کی جائے جن پر جماعت اسلامی نے اپنے دور اوّل میں کام کا آغاز کیا تھا اور دوسرے یہ کہ علوم قرآنی کی نشر و اشاعت کا وسیع بندوبست کیا جائے تاکہ ذہین نوجوان قرآن حکیم کی جانب متوجہ ہوں اور اس سرچشمۂ علم و حکمت سے کما حقہٗ سیراب ہو کر اس کی ہدایت و رہنمائی کو خالص علمی انداز میں پیش کر سکیں۔

پہلے مقصد کے لئے میں نے اوّلاً ۵۶ء کا تحریر شدہ بیان پورے دس سال بعد[1] "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا تاکہ ایک طرف تو وہ لوگ جو جماعت سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں اور علیحدہ ہونے والوں سے بھی کسی قدر حسن ظن رکھتے ہیں اور لاعلمی کے باعث حیران ہیں کہ جماعت میں ۵۶/۵۷ء میں جو اختلاف رائے پالیسی اور طریق کار کے بارے میں پیدا ہوا تھا اس کی صحیح نوعیت کیا تھی۔ ان کے سامنے اختلاف کی صحیح صورت آ سکے۔ دوسری طرف جماعت اسلامی سے منسلک احباب بھی اپنے موقف پر نظر ثانی کر سکیں اور گزشتہ نو دس سالہ جد و جہد کے نتائج کی روشنی میں غور کر سکیں کہ ۵۶/۵۷ء میں پالیسی کے بارے میں صحیح موقف کس کا تھا؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علیحدہ[2] ہونے والے حضرات بھی غور کریں کہ وہ جماعت میں کس مقصد سے شامل ہوئے تھے، کس بنیاد پر علیحدہ ہوئے تھے اور اب کیا کر رہے ہیں[3]؟

---

[1] مولانا محمد منظور نعمانی مدیر "الفرقان" لکھنؤ نے مولانا اصلاحی صاحب کے نام اپنے ایک خط میں جو "میثاق" بابت نومبر ۶۶ء میں شائع کر دیا گیا تھا کتاب اور اس کے مؤلف کے بارے میں اس تاثر کا اظہار فرمایا کہ "کتاب بہت خوب ہے اور آٹھ دس سال تک اس کو روکے رکھنے کا ان کا عمل تو بہت ہی قابل داد اور لائق سبق آموز ہے"

[2] ظاہر ہے کہ اگر مجھے جماعت پر کیچڑ اچھالنا مطلوب ہوتا تو میں یہ کتاب جماعت سے علیحدہ ہوتے ہی فوراً شائع کر دیتا لیکن اس وقت کتاب تو کیا شائع ہوتی میرے استعفے کی خبر بھی اخبار میں شائع نہ ہوئی اور استعفے کی تحریر بھی پہلی بار آج پورے سترہ سال بعد اس شمارے میں شائع ہو رہی ہے۔ اس بیان کی تحریر اور ۶۶ء میں اس کی کتابی شکل میں اشاعت سے اس کے مؤلف کا اصل مقصد کیا تھا؟ اس کے لئے مطالعہ فرمائیں ضمیمہ سوم کے حصص اوّل، دوم اور سوم!

پھر جب کتاب شائع ہو گئی تو فطری طور پر اس پہ اخبارات اور جرائد میں بھی تبصرے ہوئے اور بہت سے حضرات نے انفرادی خطوط میں بھی اظہار خیال فرمایا۔ ان تبصروں، اور آراء میں دو باتیں نہایت نمایاں تھیں۔ ایک یہ کہ کتاب کے مؤلف کے خلوص کے بارے میں بھی بالعموم اطمینان کا اظہار کیا گیا اور خود کتاب کے اسلوب نگارش کو بھی سراہا گیا اور اس کے استدلال کی قوت اور صحت کو بھی تسلیم کیا گیا[1] اور دوسرے[2] اکثر حلقوں کی جانب سے یا تو حیرت کے انداز میں یا الزامی جواب کے طور پر یہ بات کہی گئی کہ جب جماعت سے علیحدہ ہونے والوں کا موقف یہ ہے تو آخر انہوں نے علیحدگی کے بعد اپنی خطوط پر کسی مثبت جد و جہد کا آغاز کیوں نہیں کیا؟

اس دوسرے سوال یا الزام کے جواب میں میں نے واضح طور پہ تسلیم کیا کہ اگرچہ اس کے بہت سے اسباب ہیں تاہم ہے یہ بہرحال ایک اجتماعی تقصیر اور مجموعی کوتاہی جس کی تلافی جماعت سے علیحدہ ہونے والے حضرات پہ فرض ہے[3]

بحمد اللہ ان تمام امور کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور ۶۶/۶۷ء میں جماعت سے علیحدہ ہونے والے حضرات کے حلقے میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی جیسے کسی مفید اور مثبت رخ پہ ڈھالنے کی کوشش میں دو بزرگوں یعنی مولانا عبدالغفار حسن اور شیخ سلطان احمد صاحب نے خصوصی حصہ لیا۔ نتیجۃً اواخر ۶۷ء میں ایک خاصہ بڑا اجتماع رحیم یار خاں میں منعقد ہوا اور اس میں ایک قرارداد اور اس کی قدرے مفصل تشریح پہ اتفاق ہو گیا اور خاصی قوی امید قائم ہو گئی کہ اب یہ قافلہ واقعتہً سفر کا آغاز کر دے گا[4]

---

[1] جماعت سے علیحدہ ہونے والے حضرات کی آراء کا ذکر تو یہاں بے محل سا ہے۔ ان حقائق کا اعتراف غیر جانبدارانہ حلقوں کی جانب سے تو نہایت واشگاف الفاظ میں ہوا، خود جماعت کے حلقے بھی چاہے دبی زبان اور محتاط الفاظ ہی میں سہی، بہرحال ان کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس ضمن میں جماعت اسلامی ہند کے سرکاری ترجمان ماہنامہ "زندگی" رام پور کا تبصرہ تو حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے ضمیمہ سوم کے حصہ چہارم میں بعض تبصروں سے اقتباس نقل کئے جا رہے ہیں اور بعض ذاتی تاثرات بھی درج کئے جا رہے ہیں۔ [2] ملاحظہ ہو ضمیمہ سوم کا حصہ پنجم۔

[3] اس شمارے میں ضمیمہ سوم کے حصہ ششم میں وہ قرارداد شائع کی جا رہی ہے اس کی تشریح و توضیح کے سلسلے میں بعض چیزیں انشاء اللہ آئندہ شمارے میں شائع ہوں گی۔ افسوس کہ جگہ کی کمی کے باعث اس شمارے میں مذکورہ قرارداد بھی شامل نہ کی جا سکی۔

لیکن معاملہ وہی ہوا کہ ع "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!" اور بعض 'کرم فرماؤں' کی 'کرم فرمائی' سے یہ کوشش نہ صرف یہ کہ پروان چڑھنے سے پہلے ہی ختم ہو گئی بلکہ اپنے پیچھے مایوسی و بددلی اور تشتت و انتشار کے گہرے سائے چھوڑ گئی۔ میں یہاں کسی کا نام لینا نہیں چاہتا اس لئے کہ جس نے جو کچھ کیا اس کی جزا یا سزا وہ اپنے رب کے یہاں پائے گا۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ

بہرحال اس مرحلے پر میں نے خوب سوچ سمجھ کر پوری دلجمعی کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا کہ اب جو کچھ کرنا ہے انفرادی طور پر اور از خود کرنا ہے۔ نہ بزرگوں کے انتظار میں رہنا ہے کہ وہ آگے بڑھیں تو میں بھی چلوں نہ سابق رفقاء کی راہ تکنی ہے کہ وہ ساتھ قدم ملائیں تو میں بھی سفر کا آغاز کروں۔ ہر شخص خدا کی عدالت میں انفرادی طور پر پیش ہوگا اور اپنی اپنی جوابدہی کرے گا۔ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا لہٰذا کوئی اور آگے بڑھے یا نہ بڑھے اور ساتھ دے یا نہ دے، مجھے اپنی ذمہ داری کی ادائیگی کی فکر بہرحال کرنی ہے!

اب جو میں نے اپنا جائزہ لیا تو نظر آیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب حکیم کے ساتھ ایک ذہنی مناسبت بھی عطا فرما دی ہے اور کچھ قوت گویائی اور تحریر و تقریر دونوں کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کے اظہار پر کسی قدر قدرت سے بھی نواز دیا ہے۔ لہٰذا دین کی ایک حقیر سی خدمت جو مجھ سے بن آسکتی ہے اور احیائے اسلام اور شہادتِ حق کے عظیم جدّ و جہد میں ایک حقیر سا حصّہ جو میں لے سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ لوگوں کو قرآن حکیم سے روشناس اور متعارف کراؤں۔ کتاب اللہ کی عظمت کو اجاگر کروں اور لوگوں کو اس کو پڑھنے اور سمجھنے کی ترغیب دلاؤں، یہ خدمت میری نسبت سے چاہے کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو اپنی جگہ نہایت عظیم ہوگی۔ اس لئے کہ علم و حکمت کا اصل سرچشمہ قرآن حکیم ہی ہے۔ اس سے دلوں میں ایمان اور یقین کی شمعیں روشن ہوں گی۔ فکر بدلے گا، سوچ بدلے گی، نقطہ نظر تبدیل ہوگا اور اقدار (VALUES) بدل جائیں گی۔ نتیجتہً کردار و عمل میں بھی انقلاب برپا ہوگا اور اگر اللہ نے چاہا تو یہی عمل (PROCESS) کسی ہمہ گیر انقلابی جدّ و جہد کا پیش خیمہ بن جائے گا۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ!

لہٰذا میں نے اللہ کا نام لیا اور جنوری ۶۸ء سے اپنی بہتر اور بیشتر مساعی اور اپنے بہتر اور بیشتر اوقات کو اسی مقصد عظیم کے

لئے وقف کر دیا اور آج جبکہ مجھے ان خطوط پر کام کرتے سات سال کا عرصہ ہونے کو آیا ہے میں پوری طرح مطمئن ہوں کہ میرا یہ فیصلہ بالکل صحیح تھا اور واقعۃً "کرنے کا اصل کام" یہی تھا! فَلِلّٰہِ الحَمْدُ وَالمِنَّۃ !!

اپنے پیش نظر مقصد کے لئے میں نے سب سے پہلے اس امر کی کوشش کی کہ وہ چشمۂ فیض پھر پورے زور شور کے ساتھ جاری ہو جائے جس کے طفیل مجھ میں قرآن حکیم کے مطالعے کا ذوق و شوق اور اس کے علم و حکمت کے نشر و اشاعت کا جذبہ پیدا ہوا تھا یعنی مولانا امین احسن اصلاحی اور ان کے استاذ امام حمید الدین فراہیؒ کا فکر قرآنی اور اسلوب تدبّر قرآن۔

اس غرض سے اولاً میں نے تفسیر تدبّر قرآن کی جلد اوّل کی طباعت و اشاعت کا بیڑا اٹھایا، اور یہ سراسر اللہ تعالیٰ ہی کا فضل و احسان ہے کہ میں اس کٹھن وادی سے سرخرو ہو کر نکلا[1]۔ اس کے معاً بعد میں نے مولانا کی وہ دو تصانیف شائع کیں جن سے میں ابتداء ہی سے بہت متاثر تھا۔ یعنی "مبادیٔ تدبّر قرآن" اور "دعوت دین اور اس کا طریق کار" — ان پر مستزاد تھے دو چھوٹے کتابچے یعنی "قرآن اور پردہ" اور "اقامت دین کے لئے انبیاء کرام کا طریق کار"

ثانیاً مولانا اصلاحی کے ایک ہفتہ وار درس قرآن کا اہتمام کرشن نگر میں پہلے اپنے مکان پر اور بعد ازاں ایک مسجد میں کیا۔ اگرچہ وہ زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا اور مولانا کی علالت کے باعث جلد ہی بند ہو گیا۔

---

[1] مولانا عبد الماجد دریابادی مدیر "صدق جدید" لکھنؤ نے تدبّر قرآن جلد اوّل پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا: "حسنِ معنوی سے قبل نظر کتاب کے جمال ظاہری پر پڑتی ہے اور جم کر رہ جاتی ہے۔ کوئی تفسیر قرآن اتنی جمیل و جمیل چھپی ہوئی دیکھنا یاد نہیں پڑتی۔ کاغذ، کتابت، چھپائی، جلد بندی ہر اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہے": اور خود راقم نے لکھا کہ "کسی کام کی تکمیل کے بعد 'فِی کَمْ فَرَغْتَ؟' کے بجائے اصل سوال 'مَا صَنَعْتَ؟' کا ہوتا ہے تو اس پر بس اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر بجا لاؤں کم ہے کہ کتاب کی اشاعت بہں دیر چاہے ہو گئی اس کی کتابت، طباعت، جلد بندی سب کی سب نہایت عمدہ ہوئیں۔ مولانا اصلاحی کے لئے شاید کتاب کی تصنیف بھی اتنی بڑی بات نہ ہو جتنی میرے لئے اس کی طباعت اور اشاعت۔ میں اسی پر خوش ہوں ع شام از زندگی خویش کہ کارے کردم!" (میثاق مارچ و اپریل ۱۹۶۸ء)

ماہنامہ 'میثاق' جو مولانا نے جون ۵۹ء میں جاری فرمایا تھا اور جس کی اشاعت کچھ عرصے سے بند تھی اس کا دوبارہ اجرا میرے اہتمام میں اور میرے ہی زیر ادارت جولائی ۶۶ء میں ہو چکا تھا[1] جس کے ذریعے اس فکر کی اشاعت بھی ایک وسیع حلقے میں ہو رہی تھی اور مولانا اصلاحی کی تفسیر اور مولانا فراہیؒ کے 'افادات' کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری تھا!

طباعت اور اشاعت کے اس سلسلے کے لئے میں نے "دارالاشاعت الاسلامیہ"[2] کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جسے کوئی اور صورت موجود نہ ہونے کے باعث مجبوراً ذاتی ملکیت (PROPRIETORY SHIP) کی شکل دی اور واضح کر دیا کہ جیسے ہی کوئی اجتماعی ہیئت قائم ہوئی، یہ پورا سلسلہ اس کو منتقل کر دیا جائے گا۔

دوسری طرف میں نے خود اپنے درس قرآن اور اپنی بعض تحریروں اور تقریروں کی اشاعت کا سلسلہ بھی پورے اہتمام کے ساتھ شروع کر دیا۔

جہاں تک درس قرآن کا تعلق ہے اس کا آغاز اگرچہ میں نے ۶۷ء کے دوران ہی میں کر دیا تھا، چنانچہ کرشن نگر میں بھی درس کے دو حلقے قائم تھے اور ایک حلقہ کچھ عرصہ دل محمد روڈ پر واقع ایک رفیق کے مکان پر بھی قائم رہا تھا تاہم لاہور میں میرے درس قرآن کا اصل آغاز جنوری ۶۸ء میں سمن آباد میں ہوا۔

تقریب اس کی یہ ہوئی کہ میرے ایک عزیز نے اپنے مکان واقع سمن آباد میں کچھ ترمیم اور کچھ تعمیر مزید کے سلسلے میں دو کمروں کے درمیان میں سے ایک دیوار نکلوا دی جس سے ایک بڑا سا کمرہ وجود میں

---

[1] ایک ماہانہ پرچے کی ضرورت میں نے 'تحریک جماعت اسلامی' کی اشاعت کے فوراً بعد ہی محسوس کر لی تھی چنانچہ کچھ بھاگ دوڑ کر کے 'الرسالہ' کے نام سے میں نے ایک ماہنامے کا ڈیکلریشن بھی حاصل کر لیا تھا لیکن جب یہ چیز مولانا کے علم میں آئی تو انہوں نے تاکیداً فرمایا کہ 'الرسالہ' کے بجائے 'میثاق' ہی کو دوبارہ زندہ کرو۔ چنانچہ میں نے ڈیکلریشن ضائع کر دیا اور 'میثاق' ہی کا اجرا کر دیا۔

[2] "دارالاشاعت الاسلامیہ" کے قیام کا مقصد" ایک بلاک کی صورت میں اس اشاعت کے کور کے اندرونی صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔ اس ادارے نے اپنی مختصر سی زندگی میں تدبر قرآن جلد اوّل کے بعد جلد دوم بھی شائع کی۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کا ایک وقیع کتابچہ "اسلامی تحقیق کا مفہوم مدعا اور طریق کار" بھی شائع کیا اور خود راقم کے تین کتابچے شائع کئے۔ جن کا ذکر آگے آئے گا۔

آگیا جس میں کم و بیش ایک صد آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ ادھر میں اس فکر میں تو تھا ہی، میں نے فوراً تجویز پیش کر دی کہ یہاں درس قرآن ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے انہیں اس میں کیا عذر ہو سکتا تھا بس ہر اتوار کی صبح کو درس کی ہفتہ وار نشست شروع ہو گئی۔

ابتدا میں حاضری ۳۵ - ۴۰ تھی۔ کچھ ہی عرصے بعد کمرہ بھر گیا۔ صاحب خانہ نے ہمت کی اور ایک لاؤڈ سپیکر خرید لیا اور کمرے کے باہر برآمدے اور پھر اس کے بعد لان میں بھی نشست کا انتظام کر دیا۔ لیکن جلد ہی محسوس ہوا کہ ع "کچھ اور چاہیئے وسعت میرے بیاں کے لئے!"

مسجد خضراء سمن آباد سے اوّل روز ہی سے پُرزور فرمائش تھی کہ درس یہاں ہونا چاہیئے! میں مساجد کے معاملے میں بہت خائف تھا۔ اس لئے کہ اوّل تو مسجدیں اکثر و بیشتر فرقوں اور گروہوں کی ہوتی ہیں اور وہاں ایک مخصوص مسلک سے ہٹ کر کچھ کہنا ممکن نہیں ہوتا۔ پھر ان میں چودھراہٹ کے لئے رسّہ کشی بھی ہوتی رہتی ہے تاہم جب ضرورت متقاضی ہوئی تو میں نے دعوت قبول کر لی اور درس گھر سے مسجد میں منتقل ہو گیا۔ وہاں اجتماع جمعہ میں تقریر کا سلسلہ پہلے ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ اس طرح مسجد خضراء اس قرآنی تحریک کا مرکز بن گئی۔

> بعد میں مسجد خضراء میں جو غیر معمولی اور مثالی حالات رہے اور تا حال ہیں ان کے پیش نظر مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں اس کام کو شرف قبول حاصل ہو چکا تھا اور اس کی خصوصی تائید و توفیق اسے حاصل تھی۔

اسی تائید ایزدی کا نتیجہ تھا کہ جلد ہی لاہور میں اس حلقۂ درس کی دھوم ہو گئی اور اتوار کی صبح کو جبکہ عموماً طبائع پر کسل کا غلبہ بھی ہوتا ہے اور اکثر لوگوں نے بہت سے کام بھی ہفتہ وار چھٹی کے خیال سے رکھے ہوتے ہوتے ہیں۔ بغیر کسی جماعتی تعلق یا تنظیمی بندھن کے، اور بغیر کسی ہنگامی یا سیاسی مسائل کی چاشنی کے، خالصتہً قرآن مجید کا درس سننے کے لئے آنے والے لوگوں کی تعداد تین ساڑھے تین صد تک پہنچ گئی۔ جن میں اکثریت پڑھے لکھے ہی نہیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی ہوتی تھی۔

> درآنحالیکہ کہ درس دینے والا نہ عالم تھا نہ فاضل، نہ اس کے پاس کسی دارالعلوم کی سند تھی نہ کسی خانقاہ کا اجازت نامہ! بلکہ خود اپنے قول کے مطابق اس کی حیثیت محض ایک طالب علم کی تھی۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

اس حلقۂ درس کا چرچا صرف لاہور تک محدود نہ رہا بلکہ کچھ تو لاہور آنے جانے والے لوگوں کے طفیل اور زیادہ تر ان حضرات کے ذریعے جو پہلے لاہور میں تھے اور درس میں شریک ہوتے تھے۔ بعد ازاں تبدیل ہو کر یا نقل مکانی کر کے دوسرے مقامات پر چلے گئے، اس کا ذکر دور دراز تک پہنچ گیا اور میں اس حقیقت کو چھپانے کا ہرگز خواہشمند نہیں بلکہ "وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ!" کے مصداق اس کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے بڑی خوشی ہوئی جب مجھے معلوم ہوا کہ اس حلقۂ درس کے چرچے حرمین شریفین میں بھی ہوئے اور ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بھی۔ ذَالِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ۔

اس حلقے میں سب سے پہلے تقریباً چھ ماہ میں مطالعۂ قرآن حکیم کے اسی منتخب نصاب کا درس دیا جو اب ارتقائی مراحل طے کر کے گویا تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ بعد ازاں قرآن حکیم کا آغاز سے سلسلہ وار درس شروع کر دیا۔ ابتدا میں مجھے اندیشہ تھا کہ شاید اس مرحلے پر لوگوں کی دلچسپی برقرار نہ رہے لیکن صورت اس کے بالکل برعکس ہوئی اور بحمداللہ شوق بڑھتا ہی گیا۔ ۱۹۶۸ء کے اواخر اور ۱۹۶۹ء کے آغاز میں علالت اور سفر حج وغیرہ کے باعث چار ماہ کے تعطل کے بعد جب اس حلقے میں دوبارہ درس کا آغاز ہوا تو ایک بار پھر میں نے منتخب نصاب ہی کا درس دیا۔ اور اس کے بعد سلسلہ وار مطالعہ شروع کر دیا اور اب تقریباً ساڑھے چھ سال بعد ہم اس حلقے میں قرآن مجید کے چودھویں پارے کا مطالعہ کر رہے ہیں!

اس حلقے کا نقطۂ عروج تھا اگست ۱۹۷۲ء میں منعقد شدہ ایک دس روزہ تربیتی کیمپ جس میں پھر روزانہ تین اسباق کی شرح سے پورے منتخب نصاب کا درس دیا گیا اور جس کے دوران میں مسجد خضراء کا منظر واقعی ایسا تھا جیسے قرآن حکیم کا ایک حقیقی جشن منایا جا رہا ہو۔

اس کے علاوہ لاہور میں متعدد مقامات پر درس کے حلقے قائم ہوتے جس میں کہیں ہفتہ وار اور کہیں ماہوار درس ہوتے رہے اور اس طرح لاہور کی آبادی کے ایک خاصے قابل لحاظ حصے تک قرآن کی دعوت پہنچا دی گئی!

لاہور میں میرے اس کام کا ذکر سن کر کراچی سے بھی چند احباب جن کی اکثریت سے تعارف جماعت اسلامی کے سابق تعلق ہی کی بنا پر تھا غالباً اگست ۱۹۷۱ء میں لاہور آئے اور اس طرح

کراچی میں بھی اس دعوتِ قرآنی کا آغاز ہوا اور خود میری آمد و رفت کا بھی ایک مستقل سلسلہ شروع ہو گیا: جس کے دوران گاہے گاہے ملتان، رحیم یار خاں، صادق آباد اور سکھر میں بھی قیام ہو جاتا تھا اور درس قرآن کی نشستیں منعقد ہو جاتی تھیں۔

درس قرآن کے اس روز افزوں سلسلے کے ساتھ ساتھ میں نے اپنی بعض تحریریں بھی کتابچوں کی صورت میں شائع کر دی شروع کیں۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی "اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" جس کا علمی حلقوں میں بہت خیرمقدم ہوا۔ چنانچہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے ایک مفصل تحریر اس کی تحسین اور تائید میں لکھی[1] اور جناب صفدر میر نے ایک پورا مقالہ پاکستان ٹائمز کے ادارتی صفحات میں شائع کیا[2]۔ بحمد اللہ اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور چوتھا غالباً جلد ہی شائع کرنا ہو گا۔ یہ اس لئے کہ اس کی حیثیت گویا اس قرآنی تحریک کے اساسی مینی فسٹو کی بن گئی تھی اور ہے!

دوسرے نمبر پر میری ایک تقریر شائع ہوئی "قرآن اور امن عالم" جو اس وقت دستیاب نہیں ہے۔ لیکن انشاء اللہ جلد ہی دوبارہ چھپ جائے گی۔

اور پھر شائع ہوا وہ کتابچہ جسے اللہ نے وہ قبول عام عطا فرمایا کہ باید وشاید! یعنی "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" جس کا پہلا ایڈیشن دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا چنانچہ دوسری بار اسے دس ہزار کی تعداد میں شائع کرنا پڑا اور وہ بھی اب قریباً قریباً ختم ہے۔ جس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر محمد ابراہیم مرحوم و مغفور نے ایسی محبت اور عقیدت کے ساتھ کیا جو الفاظ میں

---

[1] میرے اس اصل مضمون اور چشتی صاحب کی تائیدی تحریر کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے 'صدق جدید' بابت ۷ر فروری ۱۹۶۹ء میں تحریر فرمایا:

"دونوں مقالے ماہنامہ "میثاق" لاہور میں قسط وار نکل چکے ہیں۔ دونوں کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ دونوں فکر انگیز ہیں اور ایک طرف جوش و اخلاص اور دوسری طرف دانش اور باریک بینی کے مظہر ہیں۔ مرض کی تشخیص اور تدبیر علاج دونوں میں دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ تشخیص اور علاج اناڑیوں اور عطائیوں کا سا نہیں۔ رسالہ ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے۔۔۔۔"

[2] اس سے ایک اقتباس کور کے اندر کے صفحے میں دیکھئے۔

بیان نہیں ہو سکتی اور جس کا عربی ترجمہ اب ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع ہونے والے ماہنامے 'البعث الاسلامی' میں قسط وار چھپ رہا ہے اور جسے عوام نے بھی پسند کیا اور خواص نے بھی، جس کی حضرات علماء نے بھی تحسین و تصویب فرمائی اور انگریزی تعلیم یافتہ حضرات نے بھی قدر کی اور داد دی۔ جس کے بارے میں پروفیسر چشتی صاحب نے فرمایا کہ "بلاشبہ یہ مضمون لکھ کر ڈاکٹر صاحب نے اپنے لئے سعادت اُخروی کا بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے!" اور مولانا اصلاحی صاحب نے دعا دی کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے قلم میں برکت دے کہ وہ ایسی بہت سی چیزیں لکھنے کی توفیق پائیں!" فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّۃُ!

قصہ مختصر یہ کہ ان حلقہ ہائے درسِ قرآن اور اس سلسلۂ مطبوعات نے مل جل کر اس 'دعوتِ قرآنی' کو ایک تحریک کی صورت دے دی جس نے ۷۲ء میں پہلے تنظیمی مرحلے میں قدم رکھ دیا۔

(باقی آئندہ!)

بقیہ ضمیمہ سوم صفحہ ۶۴ سے آگے

صرف آپ کے دل کی دھڑکنیں نہیں بلکہ ان سینکڑوں افراد کا درد بول رہا ہے جو کراچی سے پشاور تک پھیلے ہوتے ہیں ...."

(نجیب صدیقی، شاہی بازار، سکھر)

"... آپ کی کتاب ... صاحب سے لے کر دیکھی۔ جماعت اسلامی کے پرانے اور نئے موقف کا تضاد آپ نے خوب واضح کر دیا ہے۔ افراد کے کردار میں گراوٹ کے جو اسباب آپ نے بیان کئے ہیں وہ صحیح ہیں۔ اگر جماعت اسلامی پرانے موقف پر چلتی رہتی تو زوال پذیر نہ ہوتی یا کم از کم اس قدر جلد نہ ہوتی۔ ... بہرحال آپ کا تجزیہ بنیادی طور پر صحیح ہے اور دس سال قبل کی تحریر ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ ستائش کا مستحق ہے ..."

(ظفر الاحسن، ناظم آباد، کراچی)

"... آپ کی کتاب 'تحریک جماعت اسلامی' کا مطالعہ کیا۔ جماعت اسلامی کے پرانے اور نئے

مؤقف کا جس طرح آپ نے تجزیہ کیا ہے وہ قابل مبارکباد ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جس مقصد کے لئے آپ نے یہ کتاب لکھی ہے وہ مقصد پورا کرائے ۔۔۔"

(محمد یوسف، مقبول آباد، کراچی)

"۔۔۔ کتاب کل شام کو ملی تھی جب سے دو مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔ مبالغہ نہیں اظہار واقعہ ہے کہ اس وقت سے ذہن میں خیال کا بہاؤ تھمنے میں نہیں آتا ۔۔۔

حاصل کلام یہ ہے کہ :

* ابوالاعلیٰ مودودی اپنے علم اور انجام کے لحاظ سے ابوالکلام آزاد کے جانشین ہیں جس طرح ایک مرحلے پر آکر ابوالکلام اپنی علمی موت مر چکے تھے اسی طرح ابوالاعلیٰ مر چکے۔
* دونوں کالج اور دارالعلوم کی تعلیم سے محروم رہے۔
* دونوں اس طوفان کو اور اس توانائی کو جو انہوں نے CREATE کی تھی UTILIZE نہیں کر سکے۔
* ان کی شخصیت کی زبردست چھاپ جماعت کی تباہی میں فیصلہ کن ثابت ہوئی۔

پوری کتاب سیر حاصل تبصرہ چاہتی ہے۔ بہرحال جیسے آپ نے لکھا ہے جماعت کے دورِ اوّل کی خصوصیات اور دورِ ثانی کی تبدیلی اظہر من الشمس ہے ۔۔۔" (ڈاکٹر سید اسلم، ایم بی بی ایس، ایم آر سی پی (سینٹ دولوز ہاسپٹل، نیو پورٹ، ویلز، انگلینڈ، حال مرکز امراض قلب، جناح ہسپتال، کراچی)

۵۔ الزام و اعتراف

الزام و اعتراض (۱) "تذارک کی مؤثر زبان بلکہ اظہر من الشمس صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان جس بات کو صحیح اور درست سمجھے اس کے صرف انفرادی اظہار پر اکتفا نہ کرے بلکہ اپنے ہم رائے و ہم خیال اصحاب سے مل کر اپنے نزدیک صحیح اور درست کو بروئے کار بھی لائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والوں نے اپنے اس اقدام کے بارے میں لکھا تو بہت کچھ ہے لیکن اب تک کوئی مثبت اقدام نہیں کیا۔"

(روزنامہ نوائے وقت لاہور)

(۲) "۔۔۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک سوال قاری کے ذہن میں بڑی شدت کے ساتھ ابھرتا ہے کہ جماعت اسلامی کے بارے میں جن لوگوں کو شکایت تھی کہ وہ صحیح نہج پر کام نہیں کر رہی

ہے اور اسی بنا پر وہ اس سے الگ ہوئے کیا انہوں نے علیحدگی کے بعد سے آج تک نو دس سال کے طویل مرحلہ میں اپنے انداز فکر کے مطابق کوئی کام بھی کیا۔ کیونکہ جہاں تک تحریک اسلامی کے نصب العین کا تعلق ہے ان حضرات کو پہلے بھی اس سے اتفاق تھا اور اسی بنا پر یہ اس میں شامل ہوتے تھے اور آج بھی جب یہ کتاب طبع ہو کر سامنے آئی ہے انہوں نے اس نصب العین سے اختلاف نہیں کیا۔ ایسی صورت میں علیحدگی کے بعد بھی اس نصب العین کے لئے اپنے انداز اور طریق کار کے مطابق کام کرنے کی ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں ہو جاتے۔ ۔ ۔ ۔ ''

(روزنامہ کوہستان لاہور)

اعترافِ تقصیر " ہمیں اس کوتاہی اور تقصیر کا صاف اعتراف ہے اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علیحدہ ہونے والوں پر جماعت اسلامی اور اس کے ہم خیال حضرات کا یہ الزام بالکل درست ہے کہ انہیں مجتمع ہو کر اس نہج پر عملی جدّ و جہد کا آغاز کر دینا چاہیئے تھا جس کو وہ صحیح سمجھتے تھے ــــ تاہم ـــ خواہ اسے 'عذر گناہ بدتر از گناہ' ہی کا مصداق قرار دیا جائے ہم چند معروضات ان حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں جو محض الزام دینے سے ہی دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ ہمدردی کے ساتھ اصل مسئلہ کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ ۔ ۔

آخر میں ہم جماعت سے علیحدہ ہونے والے حضرات کی خدمت میں بھی یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ مذکورہ بالا الزام پر مشتعل ہونے کے بجائے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور واقعی جائزہ لیں کہ یہ الزام کس حد حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ گزارش ہم اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ معاصر 'کوہستان' کے تبصرے کے بعد چند رفقاء کی طرف سے ہمیں یہ مشورہ ملا تھا کہ اس کا 'جواب' دیا جائے۔ ہمارے پاس اس کا جو 'جواب' تھا وہ ہم نے حاضر کر دیا ہے۔ یہ دوسرے رفقاء کے احساسات کی ترجمانی ہو نہ ہو، ہماری دیانت دارانہ رائے یہی ہے کہ اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، بہر حال اس معاملے میں ہم سب سے مجموعی طور پر کوتاہی ہوئی ہے اور اس 'الزام' کا اصل 'جواب' ہماری جانب سے یہی ہونا چاہیئے کہ جماعت اسلامی کے طریق کار میں جن غلطیوں کی نشاندہی کر کے ہم علیحدہ ہوئے تھے، ان سے پہلو بچا کر اس مقصد کے لئے اجتماعی جد و جہد شروع کی جائے جس کے لئے جماعت اسلامی قائم ہوئی تھی ـــــ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ۔ ۔ ۔ ۔ ''

(تذکرہ و تبصرہ 'میثاق' لاہور بابت اگست ۱۹۶۶ء)

ضمیمہ اوّل

دعوتِ اسلامی
کا
نقشِ اوّلیں
اور
تحریکِ اسلامی سے شعوری تعلّق
کا آغاز
دورِ رکنیّتِ اسلامی جمعیّتِ طلبہ
۵۰ء تا ۵۴ء

۴۷ء تا ۴۹ء راقم الحروف گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم رہا۔ اس دور میں رہائش چونکہ محلہ کرشن نگر میں ایک عزیز کے مکان پر تھی لہٰذا علمی وابستگی جماعت اسلامی کے "حلقہ ہمدردان" سے رہی نہ کہ جمعیت طلبہ سے! اور اس زمانے میں اگرچہ راقم نے اس حلقے میں ایک مستند اور فعّال کارکن کی حیثیت سے کام کیا تاہم جیسا کہ اس حصّے میں درج شدہ اقتباس اوّل سے واضح ہوگا۔ راقم کے نزدیک تحریک کے ساتھ یہ تعلق 'غیر شعوری' تھا۔ ۴۹ء کے اواخر میں جب راقم میڈیکل کالج لاہور میں داخل ہوا اور رہائش بھی ہاسٹل میں منتقل ہوگئی تو اسلامی جمعیت طلبہ سے قریبی تعلق ہوا اور ۵۰ء میں راقم جمعیت کا رکن بن گیا اور یہی تحریکِ اسلامی سے راقم کے شعوری تعلق کا آغاز ہے —— اس حصّے میں درج شدہ اقتباسات سے ظاہر ہوگا کہ راقم کے ذہن پر 'دعوتِ اسلامی' کا اوّلیں نقش کیا تھا اور اس کے ذہن میں ایک مسلمان کے دینی فرائض کا اوّلیں تصوّر کیا قائم ہوا تھا! جس کے بارے میں، بحمد اللہ، اسے تا حال کوئی اشتباہ لاحق نہیں ہوا!

(۱)

ذیل کا اقتباس ایک تقریر سے ماخوذ ہے جو راقم نے ۵۰ء کے دوران کسی موقع پر اسلامی جمعیت طلبہ حلقہ میڈیکل کالج کے ایک اجتماع میں کی تھی اور جو جمعیت کے ترجمان ہفت روزہ 'عزم' لاہور کی اشاعت بابت ۱۵ نومبر ۵۰ء میں شائع ہوئی تھی۔

"خود اپنے حالات کے مشاہدے اور چند قریبی دوستوں کے مطالعے سے جو کچھ میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ ہماری بنیادی کمزوری یہ رہی ہے کہ ہم نے تحریک اسلامی کی بنیادی دعوت کو کبھی سمجھا ہی نہیں۔ یہ بات بادی النظر میں آپ کو کافی غلط سی معلوم ہوگی۔ لیکن حقیقت میں معاملہ کچھ ایسا ہی ہے ....

.... حقیقت یہ ہے کہ ہم نے دو چار کتب کے مطالعے سے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم اپنے مسلمان ہونے کا مفہوم جان گئے ہیں۔ تحریک اسلامی کے چند اجتماعات میں حاضر رہ کر ہم نے یہ سمجھا کہ ہم تحریک کی دعوت کو سمجھ گئے ہیں اور پھر اس محدود تصور کے ساتھ اپنے "فرض" کا جو نظریہ ہم نے قائم کیا وہ یہ تھا کہ دو چار پمفلٹ ادھر ادھر بانٹ کر اور محض ذہنی تعیش کے لئے دو چار بحث نما گفتگوئیں کر کے ہم یہ سمجھ بیٹھے کہ اس تحریک میں اپنا حصّہ بھی ہم نے ادا کر دیا۔

طلبہ کی اس تحریک کی سرگرمیوں میں بھی میں نے حصّہ لیا ہے جس کی دعوت پر آج ہم جمع ہوئے ہیں اور کالجوں کی فضا سے باہر کے اسلام پسند عناصر کے ساتھ بھی میں نے کام کیا ہے لیکن اس لئے نہیں کہ میرے ذہن میں خدا کی بندگی کا تصور راسخ تھا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا جذبہ تھا جو مجھے لئے لئے پھر رہا تھا بلکہ اس لئے کہ خدا کے ان بندوں میں سے جو تحریک اسلامی کا علم اٹھائے ہوئے تھے کچھ لوگوں کی تحریریں مجھے پُرزور معلوم ہوئی تھیں اور میں ان سے مرعوب سا ہو گیا تھا کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں صحیح ہے یا پھر کچھ لوگوں کی تقریروں کا مجھے چسکا پڑ گیا تھا کہ جہاں میں نے سنا کہ فلاں صاحب کی تقریر ہے میں فوراً پہنچ گیا یا پھر اس تحریک کے کارکنوں کو کتب اور پمفلٹ تقسیم کرتے دیکھ کر میں بھی دو چار پمفلٹ ادھر سے ادھر کر دیا کرتا تھا اور اس تحریک کی حمایت میں اس کے مخالفین سے پر زور مباحثے کر لیا کرتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ چلو ہم نے بھی اپنا فرض ادا کر دیا ہے......"

اپنے اور اپنے چند ساتھیوں کے تعلق تحریک کے اس تجزیے کے بعد آئندہ کے لئے جو مشورے دیئے گئے وہ یہ تھے :-

".... اصل چیز تحریک کی بنیادی دعوت ہے اور یہ وہی دعوت ہے جو ہمیشہ سے انبیاء علیہم السلام دیتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے آقا مالک اور معبود کی حیثیت سے پہچانیے اور تسلیم کیجئے۔ اس کی ہدایت کو ہدایت مانیے اور پھر پوری زندگی کو اس کی عبادت میں دے دیجئے! ... اپنے اور خدا کے درمیان تعلق کو استوار کیجئے اور خدا کے خوف کو اپنے دل میں جاگزیں کیجئے۔ یہی وہ کمپاس ہے جو آپ کی زندگی کے لئے مراحل مستقیم

متعین کرے گی اور خدا کی رضا کے حصول کو اپنا مقصد زندگی بنائیے۔ یہی وہ طاقت ہے جو گمراہی کے اس تاریک ماحول میں بڑی سے بڑی ننکابیت کے باوجود آپ کو صراطِ مستقیم پر گامزن رکھے گی! ....."

——— (۲) ———

دوسرا اقتباس راقم کی اس تقریر سے ماخوذ ہے جو ۲؍ نومبر ۱۹۵۱ء کی شام کو اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے چوتھے سالانہ اجتماع کے موقع پر وائی ایم سی اے ہال لاہور میں مولانا امین احسن اصلاحی کی زیرِ صدارت کی گئی اور جو بعد میں "ہماری دعوت اور ہمارا طریق کار" کے عنوان سے جمعیت کے دعوتی لٹریچر کا جزو لاینفک بن گئی۔

"..... جو عبارت میں نے آپ کو پڑھ کر سنائی ہے اس سے دوسری بات جو آپ نے سمجھ لی ہو گی وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے زندگی کا جو رویّہ اور طریقہ ہم نے اختیار کیا ہے وہ تین نکات پر مشتمل ہے:

اوّل عبادتِ الٰہی، دوم شہادتِ حق اور سوم اقامتِ دین۔ اب میں ذرا مختصر الفاظ میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ ان تینوں چیزوں سے ہماری مراد کیا ہے۔

عبادتِ الٰہی سے ہماری مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنا مالک، حاکم اور آقا تسلیم کر کے اپنی پوری زندگی کو اس کی اطاعت میں دے دیا جائے اور اس کی اطاعت کے سامنے اپنی خود مختاری سے دستبردار ہو جایا کرے ہماری اپنی مرضی، برادری اور خاندان کے رواج، ہماری سوسائٹی یا ریاست یہاں تک کہ پورا معاشرہ بھی ہم سے اللہ کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کرا سکے۔ ہمارے لئے صرف اسی کا حکم ہو جو کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہو وہ ہم کریں اور جو کچھ اس کی مرضی کے خلاف ہو اس سے ہم کٹ جائیں۔ غرض ہماری زندگی صرف اللہ کی اطاعت میں آ جائے، پھر یہ کہ یہ اطاعت و فرمانبرداری زندگی کے کسی ایک حصّے یا چند شعبوں میں ہی نہ ہو بلکہ تمام حصّوں اور تمام شعبوں میں ہو ——— یہ چیز ہماری زندگی کے طور طریق کا ایک خاص ڈھنگ متعین کر دیتی ہے اور ہماری زندگی کو اسی راہ پر گامزن کر دیتی ہے جو سیدھی اور صاف ہے۔ جس میں کجی اور ٹیڑھ نہیں ہے، جس میں افراط و تفریط کے دھکے نہیں ہیں اور جو نہ صرف دنیاوی فلاح بلکہ ابدی کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار کرنے والی ہے۔

شہادتِ حق سے ہماری مراد یہ ہے کہ اپنی پوری زندگی میں عبادتِ الٰہی کا طریقہ اختیار کرنے کے بعد ہم انفرادی اور اجتماعی دونوں صورتوں میں دینِ حق کی پوری نمائندگی کریں تاکہ ہم اللہ کی مخلوق کے سامنے اس کے دین کے گواہ بن کر کھڑے ہو سکیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اللہ کی جو ہدایت ہم تک پہنچی ہے ہم پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ اس ہدایت کو دوسرے لوگوں تک پہنچائیں۔ ہمیں اپنے فرض کو اس طرح ادا کرنا ہے کہ ایک طرف تو ہم قولاً خلق اللہ کو اللہ کی بندگی اختیار کرنے اور اسی کے دین میں داخل ہونے کی

دعوت دیں اور دوسری طرف عملاً اس طرزِ زندگی کا مظاہرہ کریں جو اللہ کا دین اختیار کرنے کے بعد وجود میں آتی ہے۔

اقامت دین سے ہماری مراد یہ ہے کہ اللہ کے جس دین کو ہم نے اپنی زندگیوں کے لئے اختیار کیا ہے، اُسے پوری زندگی میں قائم کرنے کی کوشش کریں اللہ کی ہدایت کو پوری دنیا میں پھیلا دیں۔ اللہ کے کلمے کو دوسرے تمام کلموں سے بلند کر دیں اور اس کے دین کو تمام دنیا کا دین بنا کر چھوڑیں۔ یہاں تک کہ پورے جہان کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہو جائے۔ اس زمین پر اللہ کے سوا کسی اور کا حکم نہ چلے اور اللہ کے طریقے کے سوا کسی دوسرے کے طریقے کی پیروی نہ کی جائے ——— یہ چیز ہماری جد وجہد کا ایک مرکز اور ہماری مساعی کی ایک سمت متعین کر دیتی ہے۔ اس میں ہمیں اپنی زندگی کا ایک نصب العین مل جاتا ہے اور یہ چیز ہمارے لئے وہ منزلِ مقصود متعین کر دیتی ہے کہ جس کی طرف ہم اپنے قافلہ کو بڑھاتے چلے جائیں۔

(۳)

تیسرا اقتباس ایک طویل تحریر سے ماخوذ ہے جو راقم نے جنوری ۱۹۵۴ء میں تحریک اسلامی کے ضمن میں طلبا کے فرائض کی وضاحت کے سلسلے میں لکھی تھی۔ اس تحریر کی بتمام و کمال طباعت کی نوبت تو کبھی نہیں آئی، البتہ اس کے بعض اقتباسات "تحریک جماعت اسلامی" کے دیباچے میں شامل کئے گئے تھے اور اس کا اصل مسودہ بھی راقم کے پاس تاحال محفوظ ہے۔

"اس سلسلے میں جو کچھ میں نے سمجھا ہے اور جس پر میں خود عمل پیرا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اصولاً دین کے مطالبات طلبہ سے بھی وہی ہیں کہ جو عام لوگوں سے ہیں۔ دینی فرائض کے اعتبار سے طلبہ اور عام لوگوں میں کوئی امتیازی فرق موجود نہیں ہے ..... دین میں صرف ایک تقسیم معتبر ہے اور وہ ہے شعور اور غیر شعور کی تقسیم۔ سنِ شعور کو پہنچنے سے قبل غیر شعوری حالت میں انسان کسی بھی چیز پر مکلف نہیں ہے لیکن سنِ شعور کو پہنچ جانے کے بعد جب کہ انسان میں سوچنے اور سمجھنے کی قوت پیدا ہو جائے وہ ان تمام فرائض پر مکلف ہو جاتا ہے جو اسلام انسان پر عاید کرتا ہے اور یہ فرائض تمام انسانوں کے لئے یکساں ہیں ان میں انسانوں کے پیشوں یا مشغلوں میں اختلاف کی بنا پر فرق واقع نہیں ہوتا۔ ہر شخص خواہ وہ معاش کے حصول کے لئے کوئی پیشہ اختیار کر چکا ہو خواہ ابھی کسی فن کے سیکھنے میں مشغول ہو اس پر مکلف ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مقدور بھر اور اپنی وسعت کے مطابق ان فرائض کی انجام دہی میں لگ جائے۔

یہ فرائض کیا ہیں؟ مختصر طور پر اگر بیان کیا جائے تو یہ فرائض دو ہیں:

(۱) اوّلاً ——— یہ کہ انسان اپنے مالک حقیقی کو پہچان کر اپنی پوری زندگی کو اس کے تابع فرمان کر دے اور اپنی خود مختاری سے اس کی طاعت کے حق میں دستبردار ہو جائے۔ یہ وہ عبادت الٰہی ہے جس کی دعوت تمام انبیاء علیہم السلام دیتے آئے ہیں اور جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنوں کے لئے واحد لائحہ عمل ٹھہرایا ہے۔

اگر اسلامی ریاست قائم ہو اور شہادتِ حق اور نمائندگیٔ اسلام کا فرض یہ ادارہ سرانجام دے رہا ہو تو افراد اپنی انفرادی حیثیت میں اللہ کی اطاعت کے طریقے کو اپنا کر، تمام فرائض کو بجا لا کر، برائیوں سے بچ کر اور نیکیوں کا اتباع کر کے اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اور اقامتِ دین اور شہادت حق کی ذمہ داری فرداً فرداً افراد پر عائد نہیں ہوتی۔

(۱۱) لیکن اگر اللہ کا دین بالفعل قائم نہ ہو بلکہ طاغوت غالب ہو تو پھر ہر اس فرد پہ جو ایمان کا دعویٰ کرے، اپنی انفرادی زندگی میں 'عبادت' کے طریقے کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ شہادتِ حق اور اقامت دین کی ذمہ داری بھی عائد ہو جاتی ہے اور یہ وہ دوسرا بڑا فرض ہے جس پہ ہر فرد مکلف ہو جاتا ہے اور جس کی ادائیگی وہ تمام شرائط کے ساتھ اور صحیح صحیح طریقے پر نہ کرے تو اس کی انفرادی طاعت گزاری اور نیکوکاری بھی اس کے لئے بے کار ہو جاتی ہے اس حالت میں شہادتِ حق اور اقامت دین کوئی اضافی نہیں ہوتی بلکہ عین بنیادی فرض ہے جس کی ادائیگی پر ایمان کے معتبر ہونے کا انحصار ہے! یہ ایسا فرض ہے جو کما حقہٗ ادا ہو تبھی ایمان معتبر ہے ورنہ نہیں۔ اس کی عدم ادائیگی کی صورت میں دوسری تمام طاعت گزاریاں اور نیکوکاریاں اور باقی تمام تقویٰ و احسان و سلوک بے کار ہے۔

اس 'اقامت دین' اور 'شہادت حق' کے آداب میں سب سے اہم چیز اور ان کی شرائط میں شرط اوّل جماعت کا اہتمام ہے۔ ہر فرد اس بات پہ مکلف ہے کہ وہ یہ فرائض ایک اجتماعی جد وجہد کی صورت میں ادا کرے۔ اگر پہلے سے کوئی جماعت یہ کام کر رہی ہو تو اس میں شریک ہو جائے اور اگر وہ کوئی ایسی جماعت نہ پائے تو تن تنہا کھڑا ہو اور لوگوں کو اپنے گرد جمع کر کے ایک ایسی جماعت کا قیام عمل میں لائے جو اقامت دین اور شہادت حق کے فرائض کو کما حقہٗ عہدہ برآ ہو۔

ظاہر بات ہے کہ جس دور میں ہم جی رہے ہیں وہ طاغوت کا دور ہے۔ اللہ کا دین قائم نہیں ہے اور اسلامی ریاست کا کہیں وجود نہیں ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں میں سے جو بھی شعور کو پہنچتا ہے اور غیر مسلموں میں سے اللہ جسے بھی قبول حق کی توفیق دیتا ہے اس کے لئے ایک ہی راہ ہے جس پہ وہ اللہ اور اس کے دین کی طرف سے مکلف ہے اور وہ یہ کہ اپنی انفرادی زندگی کو اللہ کی عبادت میں دے دے اور اپنے وقت اور اپنی محنت اور اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا بس تھوڑا سا حصہ اپنی معاش کے لئے رکھ کر باقی سارے کا سارا شہادت حق اور اقامت دین کے لئے اجتماعی جد وجہد میں کھپا دے۔

دین کا یہ مطالبہ ہر اس شخص سے ہے جو شعور رکھتا ہو اور وہ ان فرائض پہ اسی دم مکلف ہو جاتا ہے جس دم کہ یہ فرائض اس پہ واضح ہو جائیں اور یہ حقیقت اس پہ منکشف ہو جائے کہ اس کا دین اور ایمان اس سے یہ تقاضہ کرتا ہے! ... اب خواہ وہ ایک طالب علم ہو یا زندگی کے اس دور سے گزر چکا ہو اس کے لئے ایک ہی راہ ہے کہ وہ ان فرائض کی انجام دہی میں لگ جائے کسی کا طالب علم ہونا اسے ان فرائض میں سے کسی

ایک سے بھی EXEMPT نہیں کر دیتا اور دین میں اس طرح کی کسی تفریق کے لئے کوئی بنیاد موجود نہیں ہے

(تحریر جنوری ۱۹۵۴ء)

اس کے بعد اپنی اس تحریر میں راقم نے جماعت اسلامی کے دو چوٹی کے رہنماؤں کی تحریروں سے اقتباسات دیئے تھے جو درج ذیل کئے جا رہے ہیں۔ ان میں سے پہلا اقتباس "شہادتِ حق" سے ہے جو مولانا مودودی کی تالیف ہے اور دوسرا "دعوت دین اور اس کا طریق کار" سے ہے، جو مولانا اصلاحی کی تصنیف ہے۔

۱۔ "سب سے پہلے ہم مسلمانوں کو ان کا فرض یاد دلاتے ہیں اور انہیں صاف صاف بتاتے ہیں کہ اسلام کیا ہے؟ اس کے تقاضے کیا ہیں مسلمان ہونے کے معنی کیا ہیں اور مسلمان ہونے کے ساتھ کیا ذمہ داریاں آدمی پر عاید ہوتی ہیں۔ اس چیز کو جو لوگ سمجھ لیتے ہیں ان کو پھر ہم بتاتے ہیں کہ اسلام کے سب تقاضے انفرادی طور پر پورے نہیں کئے جا سکتے اس کے لئے اجتماعی سعی ضروری ہے ..... پورے دین کو قائم کرنے اور اس کی صحیح شہادت ادا کرنے کے لئے قطعاً ناگزیر ہے کہ تمام ایسے لوگ جو مسلمان ہونے کی ذمہ داریوں کا شعور اور انہیں ادا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں متحد ہو جائیں اور منظم طریق سے دین کو عملاً قائم کرنے اور دنیا کو اس کی طرف دعوت دینے کی کوشش کریں اور ان مزاحمتوں کو راستے سے ہٹائیں جو اقامت دین اور دعوت دین کی راہ میں حائل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ دین میں جماعت کو لازم قرار دیا گیا ہے اور اقامت دین اور دعوت دین کے لئے ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے ایک منظم جماعت ہو پھر خدا کی راہ میں سعی و جہد کی جائے اور یہی وجہ ہے کہ جماعت کے بغیر زندگی کو جاہلیت کی زندگی اور جماعت سے علیحدہ ہو کر رہنے کو اسلام سے علیحدگی کا ہم معنی قرار دیا گیا ہے۔

اشارہ ہے اس حدیث کی طرف جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

أَنَا آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ اللّٰهُ أَمَرَنِي بِهِنَّ الْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَإِنَّهُ مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِيدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهِ إِلَّا أَنْ يُرَاجِعَ وَمَنْ دَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ فَهُوَ مِنْ جُثَى جَهَنَّمَ قَالُوا يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَإِنْ صَامَ وَصَلَّى؟ قَالَ وَإِنْ صَلَّى وَصَامَ وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ (احمد و حاکم)

میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے۔ جماعت[1]، سمع[2]، طاعت[3]، ہجرت[4] اور خدا کی راہ میں جہاد[5]، جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی جدا ہوا اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے اتار پھینکا الا یہ کہ وہ پھر جماعت کی طرف پلٹ آئے اور جس نے جاہلیت (یعنی افتراق و انتشار) کی دعوت دی وہ جہنمی ہے۔ صحابہؓ نے دریافت کیا یا رسول اللہ اگرچہ وہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے؟ فرمایا ہاں اگرچہ وہ نماز پڑھے روزہ رکھے اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے۔

اس حدیث سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں :

(۱) کارِ دین کی صحیح ترتیب یہ ہے کہ پہلے جماعت ہو اور اس کی تنظیم ایسی ہو کہ سب لوگ کسی ایک کی بات کو سنیں اور اس کی اطاعت کریں اور پھر جیسا بھی موقع ہو اس کے لحاظ سے ہجرت اور جہاد کیا جائے۔

(۲) جماعت سے علیحدہ ہونا گویا اسلام سے علیحدہ ہونا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس زندگی کی طرف واپس جا رہا ہے جو اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت میں عربوں کی تھی کہ ان میں کوئی کسی کی سننے والا نہ تھا۔

(۳) اسلام کے بیشتر تقاضے اور اصل مقاصد جماعت اور اجتماعی سعی ہی سے پورے ہو سکتے ہیں اس لئے حضورؐ نے جماعت سے الگ ہونے والے کو اس کی نماز اور روزے اور مسلمانی کے دعوے کے باوجود اسلام سے نکلنے والا قرار دیا اسی مضمون کی شرح ہے جو حضرت عمرؓ نے اپنے اس ارشاد میں فرمائی ہے کہ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ " (ماخوذ از : شہادت حق صفحہ ۲۴-۲۶)

۲۔ اس سے معلوم ہوا کہ تبلیغ کے لئے اصل محرک درحقیقت اس فرض عظیم کا احساس ہے جو مسلمانوں پر اللہ کی طرف سے ڈالا گیا ہے اور اس میں جو چیز بطور مطمح نظر اس وقت پیش نظر رکھنی ہے وہ یہ ہے کہ وہ نظام دعوت خیر[1] پھر وجود میں آجائے جو خلق اللہ کو دین کی راہ بتا سکے اور دنیا پر اتمام حجت کر سکے۔ جب تک یہ چیز دنیا میں موجود نہیں ہے ہر مسلمان کا سب سے مقدم، سب سے بڑا اور سب سے اعلیٰ مقصد یہی ہے کہ اس کو وجود میں لانے کے لئے جو کچھ کر سکتا ہے کرے اسی کے لئے ہر مسلمان کو سونا اور جاگنا چاہیئے۔ اسی کے لئے کھانا اور پینا چاہیئے اور اسی کے لئے مرنا اور جینا چاہیئے۔ اس کے بغیر مسلمانوں کی زندگی خدائے منشاء کے بالکل خلاف ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ اپنی اس کوتاہی کے لئے کوئی عذر نہ کر سکیں گے۔"

(ماخوذ از : " دعوت دین اور اس کا طریق کار صفحہ ۳۲")

"... پھر اگر ہم نے اس جد و جہد میں بازی پا لی تو فبہا المراد اور اگر دوسری بات ہوئی تب بھی تمام راستوں میں ایک حق ہی کا راستہ ایسا ہے جس میں ناکامی کا کوئی سوال نہیں۔ اس میں اوّل قدم بھی منزل ہے اور آخر بھی ناکامی کا اس کوچہ میں گزر ہی نہیں ہے۔ اس کو مان لینے اور اس پر چلنے کا عزم راسخ کر لینے کی ضرورت ہے۔ پھر اگر تیز سواری مل گئی تو فبہا۔ یہ نہ سہی تو جھکڑے ملیں گے انہیں سے سفر کرنا ہوگا۔ یہ بھی نہیں تو دو پاؤں موجود ہیں ان سے چلیں گے۔ پاؤں بھی نہ رہیں تو آنکھیں تو ہیں ان سے نشان منزل دیکھیں گے۔ آنکھیں بھی اگر بے نور ہو جائیں تو دل کی آنکھ تو ہے جس کی بصارت کو کوئی سلب نہیں کر سکتا بشرطیکہ ایمان موجود ہو ...."

مولانا امین احسن اصلاحی

" دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات"

ضمیمہ دوم

دورِ رکنیتِ جماعتِ اسلامی

۵۵ء تا ۵۷ء

بفحوائے آیۂ قرآنی

وَقُلْ رَّبِّ

اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ
وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ
وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ
سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ۝
(بنی اسرائیل آیت ۸۰)

اس حصے میں ایک تو راقم کی درخواستِ رکنیت جماعت شائع کی جا رہی ہے جو ۱۵ نومبر ۵۴ء کو تحریر کی گئی تھی اور دوسرے جماعت کی رکنیت سے استعفے کی تحریر شائع کی جا رہی ہے جو اپریل ۵۷ء کی کسی تاریخ کو لکھی گئی تھی۔ کم و بیش بیس سال قبل کی ان تحریروں کو پڑھ کر خود راقم کے دل کی کیفیت عجیب ہو گئی اور ذہن حضرت جگر مراد آبادی کے ان اشعار کی جانب منتقل ہو گیا ؎

گزشتہ منزلیں منزل بہ منزل یاد آتی ہیں
مسافر! یہ خلشِ دل کی بآسانی نہیں جاتی

اور

یہی انجام کا مارا ہوا دل — ہلاکِ عشرتِ آغاز بھی ہے
سکوتِ لالہ و گل پہ نہ جانا — اسی میں شعلۂ آواز بھی ہے!

۱۔ درخواست رکنیت

تحریر ۱۵ر نومبر ۱۹۵۴ء

یہ درخواست، جیسا کہ ظاہر ہے، کسی سوالنامے کے جوابات پر مشتمل ہے، میرے پاس اس کی جو نقل محفوظ ہے اس میں سوالات موجود نہیں ہیں لہذا اب قارئین کو بھی جوابات ہی کے مطالعے سے سوالات کا تعین کرنا ہوگا (اسرار احمد)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمت امیر جماعت اسلامی پاکستان

بتوسط امیر جماعت اسلامی منٹگمری

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ‘

میں کافی غور و فکر اور سوچ سمجھ کے بعد اپنے آپ کو جماعت اسلامی کی رکنیت کے لئے پیش کرتا ہوں۔ گوشوارہ کے سوالات کے جوابات نمبر وار ذیل میں درج کر رہا ہوں:

(۱) اسرار احمدؐ ولد شیخ مختار احمد صاحب مکان ۴۷۷، گرجا گلی، بلاٹ گنج منٹگمری

(۲) اس وقت تقریباً ساڑھے بائیس سال (تاریخ پیدائش ۲۶ر اپریل ۱۹۳۲ء)

(۳) ا: فنی تعلیم کے سلسلے میں میں نے اسی سال پنجاب یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس کیا ہے۔

ب: علوم عمرانی —— کا باقاعدہ کسی تعلیمی ادارے میں تو میں نے مطالعہ نہیں کیا ہے تاہم چونکہ مجھے ان کے مطالعہ کا شوق رہا ہے لہذا ان کے سلسلے میں میں نے اپنے طور پر کچھ پڑھا ہے جو اگرچہ مجموعی طور پر تو کافی ہے تاہم علیحدہ علیحدہ ہر مضمون میں ہنوز ابتدا ہی کا معاملہ ہے!

ج: علم دین —— بھی اگرچہ باقاعدہ کسی دینی درس گاہ میں حاصل نہیں کیا ہے تاہم اس میں بھی میں نے اپنے ذاتی مطالعہ سے خاصی استعداد بہم پہنچائی ہے۔ تھوڑی سی عربی بھی جانتا ہوں۔ چنانچہ قرآن و حدیث کا براہ راست مطالعہ بھی میں نے کیا ہے اس کے علاوہ جماعت اسلامی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ندوۃ المصنفین دہلی اور تھانہ بھون کی مطبوعات کا کافی مطالعہ کیا ہے اور اس طرح دینی علوم میں بھی

ابتدائی معلومات کا ایک اچھا ذخیرہ میں نے فراہم کر لیا ہے۔

اگرچہ یہ چیز سوال ۱۳ کے براہ راست احاطہ میں تو نہیں آتی تاہم میں اس کا ذکر مناسب سمجھتا ہوں ـــــ اور وہ حصول علم کے سلسلے میں میرے آئندہ ارادوں کا معاملہ ہے۔ فنی تعلیم کو تو میں اپنے طور پر ختم کر چکا ہوں اور مزید اس سلسلے میں باقاعدہ مطالعہ کا میرا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ باقی 'ب' اور 'ج' میں سے بھی علوم عمران کو ثانوی درجے پر رکھتے ہوئے میں اپنی اصل توجہ علم دین کے حصول پر مرکوز کرنا چاہتا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ پہلے عربی کا باقاعدہ مطالعہ کروں اور پھر قرآن اور حدیث اور دوسرے علوم کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دوں ـــ واللہ المستعان!

(۴) ذریعہ معاش ـــ کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب میرے ہاتھ میں ایسا ہنر آ گیا ہے جس کے ذریعے میں اپنی معاشی ضروریات کو آزادانہ پورا کرنے کے ساتھ ساتھ تحریک کے کام اور حصول علم کے لئے بھی خاصا وقت نکال سکوں۔ فی الحال میں جماعت اسلامی منٹگمری کے شفاخانے میں کام کر رہا ہوں۔

(۵) یہ ایک لمبی داستان ہے ـــ میں میٹرک کے زمانے ہی میں (۱۹۴۷ء) مطالعے کے شوق کی وجہ سے جماعت کے لٹریچر سے آشنا ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں میں ضلع حصار میں تھا۔ وہاں مرزا مسرت بیگ صاحب اور چوہدری نذیر احمد صاحب ایم اے سے میرا تعارف تھا اور یہ حضرات مجھے مطالعہ کے لئے کتابیں دیتے تھے جنہیں میں پڑھا کرتا تھا۔ اس زمانے میں میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا ورکر تھا لہٰذا میں نے اس طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ انقلاب ۱۹۴۷ء کے دوران ہم لوگ حصار میں محصور ہو گئے تھے اور اس طرح تقریباً ایک ماہ بہت فرصت کا مل گیا اس زمانے میں میں تفہیم القرآن سے روشناس ہوا اور یہ مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوئی۔ بس اس کے بعد میں نے جماعت کی مطبوعات کو ایک کے بعد دوسری کے حساب سے پڑھنا شروع کر دیا اور پاکستان آنے کے بعد جلد ہی میں نے جماعت کے لٹریچر میں سے مولانا مودودی صاحب کی تمام کتابیں پڑھ ڈالیں۔ مولانا امین احسن صاحب کی کتابیں اس زمانے میں خشک معلوم ہوتی تھیں ـــ اس کے بعد میں نے جماعت اسلامی حلقہ کرشن نگر کے ساتھ عملاً کام بھی شروع کر دیا۔ کچھ دنوں بعد جب میں جمعیت طلبہ میں داخل ہو گیا تو اگرچہ جماعت اسلامی سے تنظیمی اعتبار سے تو کٹ گیا لیکن فکری طور پر وہ تمام غذا جو اس وقت تک جماعت اسلامی نے فراہم کی ہے میں برابر ہضم کرتا رہا ہوں۔ ترجمان کے پرانے فائلوں میں سے بہت سے میں نے حاصل کئے اور پڑھ ڈالے۔ مختصراً اب یہ حال ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اور مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب کی تصانیف میں نے تقریباً تمام پڑھ ڈالی ہیں ـــ یہ تقریباً کا لفظ اس وجہ سے لکھ رہا ہوں کہ ممکن ہے کہ جماعت اسلامی میں آنے سے قبل ان حضرات نے کچھ لکھا ہو جس کا تعلق اس تحریک سے نہ ہو اور وہ تحریر میں نے نہ پڑھی ہو ورنہ بقیہ وہ تمام کتابیں جو جماعت، اس کی دعوت اور اس کے کام سے متعلق ہیں میں نے پڑھ ہی نہیں ڈالی ہیں بار بار پڑھی ہیں ـــ اور ان میں سے بعض کو سبقاً سبقاً لوگوں کو پڑھایا بھی ہے۔

ان حضرات کے علاوہ نعیم صاحب کی چند کتب بھی میں نے پڑھی ہیں ـــــ اور ترجمان، چراغ راہ، زندگی اور دوسرے اہم رسائل کے کم از کم پچھلے سات سال کے تو تمام پرچے پڑھے ہیں۔

سوال میں کتابوں کے نام طلب کئے گئے ہیں ـــــ ان کو نقل کرنا بیکار ہے۔ جماعت اسلامی کا مرکزی مکتبہ وقتاً فوقتاً جو فہرستِ مطبوعات شائع کرتا ہے ان میں سے تازہ ترین فہرست کو میری پڑھی ہوئی کتابوں کی فہرست کی حیثیت سے شمار کر لیا جائے۔

(۶) اس سوال کا جواب واقعتہً بہت مشکل ہے۔

- "کیا اثر پڑنا چاہیئے" پر میں ایک طویل تقریر بھی کر سکتا ہوں اور تحریر بھی لکھ سکتا ہوں
- لیکن "کیا اثر ہوا ہے" پر میں خود کچھ نہیں کہہ سکتا! اس معاملے میں آپ کو اُن حضرات کی آراء پر انحصار کرنا ہوگا جن سے اس سات سالہ دور میں جو میں نے تحریک اسلامی سے متعارف ہونے کے بعد بسر کئے ہیں میرا سابقہ رہا ہے۔ مثلاً ۱۹۶۷ء اور ۱۹۶۸ء کے دوران ـــ ماسٹر شہاب الدین صاحب ناظم جماعت اسلامی حلقہ کرشن نگر لاہور

۱۹۶۹ء سے اب تک: لاہور میں ـــــ میرا تعلق یا تو جماعت کے مرکز سے رہا اس حیثیت میں مرکزی رفقاء مجھے جانتے ہیں یا پھر جمعیت طلبا سے رہا اور اس حیثیت سے جمعیت کے ذمہ دار حضرات کوئی رائے دے سکیں گے۔

۱۹۷۱ء منٹگمری میں ـــــ میں تعطیلات کے زمانے میں آتا رہا اور اس حیثیت سے میرے بارے میں رائے یا تو شیخ عبدالحمید صاحب (حال ملتان) دے سکیں گے جو اس سے قبل جماعت اسلامی منٹگمری کے امیر تھے یا پھر موجودہ ارکان جماعت منٹگمری میرے بارے میں کچھ بتا سکیں گے۔

- البتہ ایک بات ہے اور وہ یہ کہ میں جو آج یہ درخواستِ رکنیت تحریر کر رہا ہوں تو اس کا صاف مطلب ہے کہ میں یہ رائے تو رکھتا ہوں کہ جماعت کے انقلابی لٹریچر نے میرے "خیالات، عملی زندگی اور اخلاق" پر کم از کم اتنا انقلابی اثر تو ڈالا ہے کہ میں جماعت کی رکنیت کے لئے اپنے آپ کو پیش کر سکوں۔

(۷) جی ہاں بہت اچھی طرح!

(۸) اس سوال کا جواب کسی قدر سوال ۶ میں آچکا ہے۔

مختصراً یہ کہ میں اس دور میں پیدا ہوا ہوں جبکہ احرار اور خاکسار تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ ملک میں دو ہی طاقتیں تھیں مسلم لیگ اور کانگرس۔ یا پھر جماعت اسلامی جو ایک فکری جنگ لڑ رہی تھی۔ فطری طور پر میں اس وقت مسلم لیگ کے ساتھ تھا اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں نے کام بھی کافی کیا۔ اس کے بعد

میں جماعت اسلامی کے لٹریچر سے متعارف ہوا اور اس کے ساتھ پوری طرح متفق ہو گیا۔ وہ دن اور آج کا دن میں اسی کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ اسلامی جمعیت طلبہ میں ایک رکن کی حیثیت سے اور ایک سرگرم کارکن کی طرح میں نے چار سال کام کیا ہے اور اس دوران ایک لمحہ بھی مجھ پر ایسا نہیں گزرا کہ میں نے اصولاً اور فکراً جمعیت طلبا کو جماعت اسلامی سے علیحدہ متصور کیا ہو۔ اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ پوری دنیا میں خالص تحریک اسلامی تو محض جماعت اسلامی ہے (پاکستان کی بھی اور ہندوستان کی بھی) البتہ دینی ہی مقاصد کے لئے اور اچھے کام کرنے والے اور ادارے بھی ہیں اور جماعتیں بھی ہیں، پاکستان میں بھی اور باقی دنیا میں بھی۔ ان اداروں نے یا جماعتوں نے مجھے بس اس حد تک تو متاثر کیا ہے لیکن جماعت اسلامی کے سوا کسی اور ادارے یا جماعت کے مقصد اور طریق کار کو میں خالصتہً اسلامی اور ٹھیٹھ دینی نہیں سمجھتا!

(۹) جماعت اسلامی کی رکنیت پر مجھے، احساس فرض نے آمادہ کیا ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ راہ خاردار ہے اور مصائب و مشکلات سے بھرپور ہے میں اس کی رکنیت کے لئے اپنے آپ کو اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ:

میری رائے میں اللہ تعالیٰ کا مطالبہ ہر ذی شعور انسان سے بالعموم اور ہر مدعی ایمان و اسلام سے بالخصوص یہ ہے کہ (۱) اولاً خود اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کے رسولؐ کی ہدایت کے تحت دے دے، فرائض سے عہدہ برآ ہو، عبادات بجا لائے اور حقوق نفس اور حقوق العباد کی ادائیگی میں وہ طریقہ اختیار کرے کہ جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے بتایا ہے۔ (۲) ثانیاً وہ اللہ کے دین کو دنیا میں عملاً قائم کرنے کے لئے مال اور جان صرف کرے اور اپنی قوتوں، قابلیتوں اور صلاحیتوں کو لگائے ——— (اسی کا نام اقامت دین یا شہادت حق ہے!) (۳) ثالثاً وہ اس کام کے لئے یا تو کسی ایسی جماعت میں شریک ہو جس کے بارے میں وہ پورے طور پر مطمئن ہو جائے کہ وہ بالکل اور ٹھیک ٹھیک اسی مقصد کے لئے کام کر رہی ہے ورنہ پھر خود کھڑا ہو اور اس کام کے لئے لوگوں کو اپنے گرد جمع کر کے ایک جماعت بنائے جو اس کام کو اس طرح کرے!

میں یہ محسوس کرتا ہوں ——— اور آج نہیں بلکہ آج سے چار سال قبل سے محسوس کر رہا ہوں کہ اقامت دین میرا فرض ہے اور خدا کا شکر ہے کہ میں اس دور میں پیدا ہوا جبکہ خالص اقامت دین کے لئے کام کرنے کے لئے جماعت اسلامی قائم ہو چکی ہے اور میں آسانی کے ساتھ اس میں شریک ہو کر اپنے فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سعی کر سکتا ہوں۔ اس لحاظ سے میں جماعت اسلامی کے وجود کو اپنے لئے ایک نعمت متصور کرتا ہوں اس لئے کہ اگر یہ نہ ہوتی تو اپنے طور پر کام کرنا بس میں نہ ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں باز پرس کڑی ہو جاتی۔ چار سال میں جمعیت طلبہ

میں رہا ہوں تو اسی تصور کے تحت کہ یہاں کام کر کے در اصل میں جماعت اسلامی ہی کا کام کر رہا ہوں۔ (اس سلسلے میں میں نے واضح طور پر امیر جماعت سے استفسار کر کے ان کی رضا حاصل کر لی تھی) اور اب جبکہ دور طالب علمی کے اختتام پر میں جمعیت طلبہ سے علیحدہ ہو چکا ہوں تو اپنی پہلی فرصت میں یہ درخواست رقم کر رہا ہوں۔ چاہتا تو میں یہ تھا کہ جس روز جمعیت طلبہ سے علیحدہ ہوں اسی روز جماعت کی رکنیت کی درخواست دے دوں اور ایک دن بھی مجھ پر کسی جماعت کے بغیر نہ گزرے لیکن صرف اس وجہ سے کہ معلوم نہ تھا کہ کہاں SETTLE ہوں گا اور کہاں درخواست دینی چاہیئے تقریباً پندرہ دن کی دیر ہو گئی ہے —— بہر حال آج یہ درخواست دے دینے کے بعد مطمئن ہوں گا کہ میں نے اپنی طرف سے اپنے آپ کو جماعت کی رکنیت کے لئے پیش کر دیا ہے !! اور اس حیثیت سے جب تک میری رکنیت منظور ہو اس وقت تک بھی اپنے طور پر میں جماعت کے بغیر زندگی بسر نہیں کر رہا ہوں گا۔

(۱۰) میں نے جماعت کے دستور کا ایک مرتبہ پھر از سر نو باقاعدہ مطالعہ کر لیا ہے اور میں مطمئن ہوں کہ میری زندگی میں جماعت کے دستور کے خلاف کوئی چیز موجود نہیں ہے ! سوال نامہ میں خصوصاً دفعہ ۴ کے بارے میں دریافت کیا گیا ہے اور میں نے نئے اور پرانے دونوں دستوروں کی دفعہ (۴) کو دیکھ لیا ہے۔ اور مطمئن ہوں کہ میں اپنی زندگی میں ایسی کوئی چیز نہیں پاتا جو مجھے رکنیت جماعت کے ناقابل بنا دیتی ہو!

(۱۱) آخری سوال کے جواب میں میں محض "جی ہاں !" پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں بلند و بالا عزائم اور صبر و استقامت کے ارادے کا اظہار نہ ممکن ہے نہ مناسب ! اس راہ کے تقاضوں کو میں نے سمجھ تو خوب لیا ہے لیکن ان کی بالفعل ادائیگی اور کماحقہٗ تکمیل محض اللہ کی توفیق اور اس کی مدد پر منحصر ہے الحمدُ للهِ الَّذِی هدانا لِهٰذا وَمَا كُنَّا لِنهتدِیَ لَولَا اَنْ هَدانا الله ؕ کے بعد اب میں رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بعدَ اِذْ هَدَیتنا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ کے سہارے آج اتنا کچھ عرض کر دینے کے بعد اپنے دستخط ثبت کر دینے کی جرأت کر رہا ہوں فقط

خاکسار اسرار احمد عفی عنہٗ

منٹگمری ۱۵ رنومبر ۱۹۵۴ء

نوٹ : اس درخواست کی تحریر کے ٹھیک تین ماہ بعد یعنی ۱۵ فروری ۱۹۵۵ء کو راقم الحروف کو اس کی منظوری کی اطلاع دی گئی، چنانچہ اگلے ہی روز یعنی ۱۶ فروری ۱۹۵۵ء کو راقم نے جماعت اسلامی منٹگمری شہر کے اجتماع میں رکنیت جماعت کا حلف اٹھا لیا۔

(۲)

استعفاء

اپریل ۱۹۵۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ ذیل کی سطور ۲۹ رمضان المبارک کو مسجد میں اعتکاف کی حالت میں لکھ رہا ہوں اور ان کے ذریعے اس فیصلے کا اظہار مقصود ہے جس پر میں حالت اعتکاف میں مسلسل تین روز کے سوچ و بچار کے بعد پہنچا ہوں، یعنی یہ کہ میں جماعت اسلامی کی رکنیت سے مستعفی ہو جاؤں۔

---

۱۵ نومبر ۱۹۵۴ء کو جب میں نے جماعت کی رکنیت کے لئے درخواست تحریر کی تو جماعت کے بارے میں میرا نقطہ نظر یہ تھا:

"میں یہ محسوس کرتا ہوں اور آج سے نہیں بلکہ آج سے چار سال قبل سے محسوس کر رہا ہوں کہ **اقامت دین میرا فرض ہے**۔ اور خدا کا شکر ہے کہ میں اس دور میں پیدا ہوا جبکہ خالصتہً اقامت دین کے کام کے لئے جماعت اسلامی قائم ہو چکی ہے اور میں آسانی کے ساتھ اس میں شریک ہو کر اپنے **فرض** سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سعی کر سکتا ہوں اس لحاظ سے **میں جماعت اسلامی کے وجود کو اپنے لئے ایک نعمت متصور کرتا ہوں**۔ اس لئے کہ اگر یہ نہ ہوتی تو خود کام کرنا بہرحال بس میں نہ ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں باز پرس کڑی ہو جاتی ...."

اور

".... میں یہ سمجھتا ہوں کہ پوری دنیا میں خالص تحریک اسلامی تو محض جماعت اسلامی ہے (پاکستان کی بھی اور ہندوستان کی بھی) البتہ دینی ہی مقاصد کے لئے اور اچھے کام کرنے والے اور ادارے بھی ہیں، اور جماعتیں بھی ہیں۔ پاکستان میں بھی اور باقی دنیا میں بھی۔ ان اداروں یا جماعتوں نے مجھے اس حد تک تو متاثر کیا ہے لیکن **جماعت اسلامی کے سوا کسی اور ادارے یا جماعت کے مقصد اور طریق کار کو میں خالصتہً اسلامی اور ٹھیٹھ دینی نہیں سمجھتا**! ..."

بدقسمتی سے جماعت کے بارے میں میرا یہ نقطہ نظر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ فروری ۱۹۵۵ء میں میری درخواست رکنیت منظور ہوئی اور اس کے چند ہی ماہ بعد سے جماعت کے بارے میں میرے شکوک و شبہات بڑھنے شروع ہو گئے تا آنکہ اجتماع سالانہ تک میں جماعت اسلامی پاکستان کے بارے میں کم از کم اپنے فہم کی حد تک ایک

پختہ تر رائے قائم کر چکا تھا۔ اس اجتماع کے موقعہ پر جماعت کے اندر بے اطمینانی اور پالیسی کے بارے میں اختلافات کا جائزہ دینے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی اور میں مطمئن ہو گیا کہ ایک پرسکون ماحول اور افہام و تفہیم کے انداز میں کمیٹی کے سامنے اپنی بات رکھ سکوں گا۔ اجتماع سے واپسی کے بعد میں جائزہ کمیٹی کی آمد کے انتظار میں رہا بالآخر ۳۰ ستمبر ۵۶ء کو بمقام اوکاڑہ ترمیم شدہ جائزہ کمیٹی سے گفتگو کا شرف حاصل ہوا اور اواخر اکتوبر تک میں نے اپنے خیالات کو ایک مفصل بیان کی شکل میں قلم بند کر کے مولانا عبدالرحیم اشرف صاحب کنوینر جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کر دیا۔

اپنے اس بیان میں میں نے قبل از تقسیم ہند کی جماعت اسلامی اور بعد از تقسیم کی جماعت پاکستان کا تفصیل کے ساتھ موازنہ اور مقابلہ کیا اور اپنی ناقص قوت تحریر کی حد تک پوری طرح محنت اور کوشش کر کے اپنی یہ رائے واضح کی کہ پالیسی اور طریق کار کے اعتبار سے تقسیم سے ماقبل اور اس کے مابعد کی جماعت میں واضح تفاوت و اختلاف بلکہ تضاد پایا جاتا ہے اور جبکہ قبل از تقسیم کی جماعت ایک خالص اور ٹھیٹھ اسلامی تحریک کا نقشہ پیش کرتی ہے وہاں بعد از تقسیم کی جماعت ایک ایسی قومی سیاسی جماعت بن گئی ہے جس میں دین کا داعیہ چاہے کم یا زیادہ موجود ہو خالص اسلامی تحریک کی خصوصیات موجود نہیں ہے —— پھر اپنی محدود بصیرت کے مطابق میں نے اس بنیادی غلطی کی نشاندہی بھی کی کہ جس کے باعث اس تحریک کی نوعیت میں اس قدر عظیم الشان فرق آ گیا تھا۔ آخر میں میں نے لکھا تھا :

> "میں نے نہ یہ کہا ہے اور نہ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ ۴۷ء میں جب طریق کار تبدیل کیا گیا تو دانستہ طور پر ان لازمی نتائج کو جاننے کے باوجود اور اس تبدیلی کا ادراک کرنے کے باوجود کیا گیا جو اس طرح اس پوری تحریک کی بنیادی نوعیت میں برپا ہو رہی تھی۔ لیکن یہ بہر حال میں سمجھتا ہوں اور اسی کو وضاحت کے ساتھ میں نے اس قدر طویل تحریر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ طریق کار کی اس تبدیلی نے جماعت کو سطحی طور پر متاثر نہیں کیا بلکہ اس کو جڑوں سے لے کر شاخوں تک اور سر سے لے کر پیر تک بدل کر رکھ دیا ہے .....
> میری رائے میں اصل تحریک اسلامی ۴۷ء میں حقیقتاً اور اصولاً ختم ہو گئی تھی اس کے بعد جماعت اسلامی کی قومی جدّ و جہد کے ساتھ ساتھ اس اصل تحریک اسلامی کے کچھ اثرات ایک عرصہ تک برسرِ کار رہے ہیں لیکن اب وہ بھی دم توڑ چکے ہیں اور اب اس تحریک میں سے کچھ باقی ہے تو وہ ان چند پاک نفوس کے سوا اور کچھ نہیں ہے جنہیں اس اصل تحریکِ اسلامی کی دعوت نے کھینچا تھا اور جو ابھی تک جماعت اسلامی کی قومی تحریک کا دامن اسی اصل تحریکِ اسلامی کے مغالطہ میں تھامے چلے آ رہے ہیں !"

اس میں صرف اس بات کا اضافہ اور کر لیجیے کہ اس قدر شدید رائے رکھنے کے باوجود اس وقت تک میں

مایوس نہیں تھا بلکہ ایک طرف مجھے قوی امید تھی کہ :

"..... مجھے اب مستقبل کے بارے میں کوئی امید ہے تو وہ بھی ان پاک نفوس کے خلوص سے ہے کہ اگر آج بھی ان پر واضح ہو جائے کہ فلاں جگہ سے ہم غلط موڑ مڑ آئے ہیں اور اب غلط راستے پر چل رہے ہیں تو وہ آگے ہی بڑھنے کی دھن میں غلط راستے ہی پر چلتے رہنے کو گوارا کرنے کی بجائے واپس مڑ کر صحیح راستہ اختیار کرنے میں پس و پیش سے کام نہ لیں گے چاہے اس طرح انہیں ایک طویل مسافت کو دوبارہ قطع کر کے سفر کو تقریباً از سر نو ہی شروع کرنا پڑے ..."

اور دوسری طرف اپنے ہی بر سرِ غلط ہونے کے امکان کے پیش نظر میں نے یہ گزارش بھی کی تھی :-

"..... پھر اللہ گواہ ہے کہ اس بات کے کہنے میں کوئی بری نیت محرک نہیں بنی ہے۔ اس غرض سے یہ گزارشات پیش کر رہا ہوں کہ اگر اس طریقے سے اللہ تعالیٰ ہماری غلطی کو (اگر وہ ہے!) واضح کر دے تو فبہا ورنہ کم از کم مجھ پر تو اپنی غلطی واضح ہو جائے گی اور میں زیادہ اطمینان قلب کے ساتھ تحریک اسلامی کے ساتھ وابستہ ہو کر عملاً کام کر سکوں گا!"

یہی وجہ ہے کہ اس بیان کے تحریر کرنے تک مجھ پر نہ بد دلی چھائی اور نہ ہی قوای میں جمود پیدا ہوا بلکہ میں حسب سابق تندہی کے ساتھ جماعت کا کام کرتا رہا۔ اپنے بیان میں بھی میں نے لکھا تھا کہ اب تک :

"جماعت اور اس کے کام کے لئے سرگرمی اور محویت میں میرے اندر کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے ...!"

جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے سے لے کر اجتماع ماچھی گوٹھ تک جماعت اسلامی پاکستان کے حلقوں میں جن ناخوشگوار اور کریہہ واقعات کا چکر چلا ہے ان کو محض یاد کرنے ہی سے انسان کو سخت ذہنی اذیت اور روحانی کرب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس پندرہ روزہ شوریٰ کے دوران جس میں رپورٹ پر غور ہوا شوریٰ کے فعال عناصر کا دو متقابل اور متحارب گروہوں میں تقسیم ہو جانا، بہت رد و قدح کے بعد اور بالآخر "خوف انتشار" کی بنا پر بالاکراہ کسر و انکسار کے ذریعے ایک لایعنی اور مہمل قرار داد کا پاس ہونا۔ پھر اس کی مختلف توجیہیں اور جماعت کے مختلف حلقوں کی طرف سے مختلف ردِ عمل، اس کے نتیجے کے طور پر سازشوں کی برملا تہمتیں، اکابرین جماعت کا ایک دوسرے کے بارے میں انتہائی گری ہوئی رایوں کا اظہار، سعید ملک صاحب کا سنسنی خیز استعفا اور اس کا اسی انداز میں قیم جماعت کی طرف سے تعاقب، امیر جماعت کا جائزہ کمیٹی کے چاروں ارکان پر بخوبی، گروہ بندی اور "غیر شعوری سازش" کا الزام، مولانا امین احسن صاحب کا استعفیٰ از رکنیت جماعت، امیر جماعت کا جذباتی انداز میں استعفیٰ از امارتِ جماعت، ایسے الفاظ کے ساتھ کہ جس سے کچھ لوگوں نے سمجھا کہ اب مولانا تا دمِ حیات کبھی امارت کا منصب دوبارہ قبول نہ کریں گے اور کچھ دوسرے لوگوں نے سمجھا کہ یہ محض ایک اظہار اعتماد (VOTE OF CONFIDENCE) کا مطالبہ ہے اور پھر جماعت کے اندر ایک مہم کے انداز

ہیں امیر جماعت پر قرار داد بائے اعتماد، دو اراکین مرکزی شوریٰ کی رکنیت جماعت کا تعطل، مولانا عبدالجبار غازی صاحب کا استعفیٰ از رکنیت، مولانا عبدالغفار حسن صاحب کا استعفیٰ از مناصب جماعت، سلطان احمد صاحب کا استعفیٰ از رکنیت شوریٰ ..... اور اختلاف کرنے والے لوگوں کا یہ حال کہ انتہائی سخت باتیں کہہ رہے ہیں گھناؤنے سے گھناؤنے الزامات لگائے جا رہے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ نیتوں پر شدید حملے ہو رہے ہیں اور حال ہی کے نہیں ماضی کے واقعات سے استشہاد ہو رہا ہے لیکن جب کہا جاتا کہ شرافت کے ساتھ اس گند سے نکلیے اور جو کام ان سے بن پڑتا ہے انہیں کرنے دیجئے اور جو کام آپ کر سکتے ہوں آپ باہر جا کر کیجئے تو اس بات سے باصرار انکار ــــــ یہ سارے معاملات میرے لئے اس اعتبار سے تو غیر متوقع نہ تھے کہ میری تو رائے ہی یہ تھی اب جماعت ایک قومی سیاسی جماعت بن گئی ہے اور یہ اس کے ناگزیر ثمرات ہیں لیکن اس لحاظ سے کمر توڑ دینے والے تھے کہ جماعت میں اخلاقی تنزل اور گراوٹ کے بارے میں ایسی اتنی پست رائے میں نے بھی قائم نہیں کی تھی! ــــــ اس عرصہ میں میں اوّلاً تو جماعت میں ایک عضوِ معطل بن کر رہ گیا اور بالآخر جنوری ۵۷ء میں میں نے شدّت تاثر میں جماعت کی رکنیت سے زبانی استعفیٰ مقامی امیر جماعت کے سامنے پیش کر دیا۔

لیکن جب مقامی اراکین و امیر اور حلقہ کے ذمہ دار حضرات نے سمجھایا کہ اجتماع ماچھی گوٹھ تک صبر کر لو تو میں نے بھی اس بات کو معقول پا کر اپنا استعفیٰ واپس لے لیا۔

اجتماع سے کچھ دن قبل اطلاعات ملنی شروع ہوئیں کہ "لاہور میں مطلع صاف ہو رہا ہے" اور ایک بار پھر سمجھوتے کی کوشش ہو رہی ہے تاکہ اجتماع ارکان سے قبل ہی شوریٰ کی طرف سے ایک متفقہ قرار داد منظور ہو جائے اور ارکان کے سامنے اکابرین جماعت کا اختلاف رائے پیش نہ ہو۔ اس پر میں نے دیگر پانچ ارکان جماعت اسلامی منٹگمری کی شرکت میں ایک مفصل خط قائم مقام امیر جماعت کے توسط سے جماعت کی شوریٰ کو لکھا (وہ جماعت کے ریکارڈ میں محفوظ ہوگا اسے دیکھ لیا جائے!) جس میں شوریٰ سے یہ گزارش کی گئی تھی کہ بار بار ایسی کمزور مصالحت کی کوششیں نقصان دہ ثابت ہوں گی جس کی بنیاد کسی مثبت اور واقعی اساس کی بجائے جماعت کے اندر انتشار کے خوف کی منفی اساس پر ہو۔ اکابرین جماعت میں جو دو نقطہ ہائے نظر پالیسی اور طریق کار کے بارے میں پائے جاتے ہیں انہیں صاف صاف ارکان میں آجانا چاہیئے اور پھر ارکان کو شعوری طور پر یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ وہ کدھر جانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے گروہ کے لئے صحیح یہ ہوگا کہ اگر وہ ارکان کے رجحان کے ساتھ (RECONCILE) کر سکیں تو فبہا ورنہ جماعت کے اندر مزید فساد کرنے اور کشمکش برپا کرنے کی نسبت خود ان کے لئے بھی اور جماعت کے حق میں بھی بہتر یہی ہے کہ وہ جماعت سے نکل جائیں۔ خط کے آخر میں خط لکھنے والوں نے اپنے بارے میں دو صورتیں تجویز کی تھیں۔

"اوّلاً یہ کہ کم از کم ہمیں اس بات کا پورا موقع دیا جائے کہ ہم اجتماعِ ارکان میں اپنے نقطۂ نظر کو وضاحت

سے رکھ دیں اس کام کے لئے جتنا وقت ہمیں درکار ہو ہمیں دیا جائے اور ہم پر کوئی روک ٹوک نہ کی جائے کہ یہ کہا جا سکتا ہے اور یہ نہیں تاکہ ہم پورے طور پر مطمئن ہو جائیں کہ ہم نے اپنی بات کہہ دی ہے یہ اس لئے ضروری ہے کہ ہم "منافقت" سے ساتھ جماعت کے ساتھ چلنے کو اپنے اوپر بھی ظلم سمجھتے ہیں اس لئے کہ اس طرح آخرت میں اجر تو دور رہا عذاب کا خطرہ نظر آتا ہے —— اور جماعت پر بھی ظلم سمجھتے ہیں کہ ہم اس کے مجموعی ذہن سے علیحدہ ایک ذہن رکھتے ہیں اور پھر بھی ساتھ چلیں اور عملاً اس کا حاصل یہ ہو کہ نہ خود چلیں اور نہ دوسروں کو چلنے دیں۔

اور، اگر یہ بھی قابل قبول نہ ہو تو ہمیں اجتماع سے قبل ہی مطلع کر دیا جائے ہم اس کے لئے پورے انشراح صدر کے ساتھ تیار ہیں کہ خاموشی کے ساتھ جماعت سے علیحدہ ہو جائیں اور نہ اپنی منزل کھوٹی کریں اور نہ جماعت کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہوں۔ ہماری اس طرح کی علیحدگی انشاء اللہ جماعت کے لئے نقصان کا موجب نہ ہوگی بلکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح ہم شاید جماعت کی کوئی نہ کوئی خدمت ہی سر انجام دے سکیں گے۔"

ماچھی گوٹھ حاضر ہوا تو جس چیز کا خدشہ تھا وہی ہوا۔ کلیا میں گڑھ چھوڑا جا چکا تھا۔ ایک متفقہ قرارداد شوریٰ کی طرف سے اجتماع ارکان میں پیش ہوئی تھی۔ اجتماع کا سارا پروگرام ایک سوچی سمجھی سکیم کے ساتھ اس طرح بنایا جا چکا تھا کہ اوّل تو کوئی اختلافی آواز اٹھائی ہی نہ جا سکے اور اٹھے بھی تو پوری طرح محبوس ہو کر۔ میں یہاں منتظمین اجتماع کی نیتوں پر حملہ نہیں کرنا چاہتا انہوں نے جو کچھ کیا انتہائی خلوص کے ساتھ "اھون البلیتین" کے مشہور و معروف فلسفہ کے تحت ایک بہت بڑے شر یعنی جماعت کے انتشار سے بچنے کے لئے کیا لیکن یہ بھی بہرحال اپنی جگہ ایک واقعہ ہے کہ اجتماع کو جس طرح CONDUCT کیا گیا اس میں کسی اختلافی آواز کا اٹھنا خصوصاً ایسی حالت میں کہ "اکابرین" میں سے تو کوئی میدان میں رہا ہی نہیں تھا چند بے وقعت "اصاغرین" باقی تھے۔ ممکن نہ تھا! مولانا مودودی کے لئے درآں حالیکہ وہ اس وقت امیر نہیں تھے غیر محدود وقت کی کھلی چھٹی اور اختلاف کرنے والوں کے لئے سختی سے جھگڑا کر کر کے محدود وقت دینا اور پھر اس پر سختی سے عمل کرانا۔ اور باوجود اس کے کہ یہ ایک غیر معمولی اور ہنگامی اجتماع تھا ابتدا سے اس کا پروگرام معمولی اجتماعات کی طرح بنا کر بہت سا وقت قیم جماعت کی رپورٹ پر صرف کرا دینا خواہ خلوص کے ساتھ ہی ہوا ہو، بہرحال اختلاف کرنے والوں کے ساتھ انصاف نہ تھا۔

"تَحْسَبُهُمْ جَمِيعاً وَقُلُوبُهُمْ شَتّٰى" کا جو منظر اس اجتماع نے پیش کیا اس میں جماعت کے لئے بڑی عبرت ہے، بالکل مختلف الخیال اور متضاد آراء کے حامل لوگوں کو جوڑ کر ساتھ لے کر چلنے کی کوشش یہی نتائج برپا کر سکتی ہے۔ قرارداد شوریٰ کی متفق علیہ تھی اور مبینہ طور پر مولانا مودودی صاحب کو شوریٰ ہی نے

SPOKESMAN بنا کر اس قرارداد کی تشریح پر مامور کیا تھا لیکن مولانا کی چھ گھنٹے سے زائد تقریر کے بعد بھی مولانا امین احسن صاحب نے محسوس کیا کہ قرارداد کے کچھ "مضمرات اور مقدرات" بیان ہونے سے رہ گئے ہیں اور پھر ان کو بیان کرنے جو کھڑے ہوئے تو ایک ایسی تقریر کر ڈالی کہ مولانا مودودی صاحب کی پوری تقریر کی تردید ہو گئی اور مجبوراً نعیم صدیقی صاحب کو اصلاحی صاحب کی تقریر کے اثرات دھونے کے لئے تقریر کرنی پڑی اور یہاں تک کہنا پڑا کہ اصلاحی صاحب امراض دماغی میں مبتلا ہیں۔ متعدد معزز اراکین شوریٰ کا یہ حال رہا کہ "مذبذبین بین ذالک" نہ ادھر ہوتے ہیں نہ ادھر۔ ابھی قرارداد سے اتفاق ہے تو ابھی اتفاق ختم ہو گیا ہے اور اختلاف پیدا ہو گیا ہے تا آنکہ ایک صاحب اپنا اتفاق واپس لے کر ایک متبادل قرارداد لاتے ہیں اور اس کے حق میں ایک طویل، مدلل اور مفصل تقریر کرتے ہیں لیکن آخر میں اچانک خود اپنی ہی پیش کردہ قرارداد واپس لے کر سٹیج سے اتر آتے ہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ !

میرے لئے اس میں بھی کوئی عجیب بات نہ تھی اس لئے کہ میں پہلے ہی اپنے خط میں لکھ چکا تھا :

"اس طرح 'حب علی' کی بجائے 'بغض معاویہ' پر جو اتحاد قائم ہو، ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد بے حد کمزور ہوگی ... !"

ذاتی طور پر میں اس اجتماع میں ایک بڑے مخمصہ میں پھنس گیا تھا۔ مولانا مودودی صاحب نے پالیسی کی جو تشریح بیان کی اس سے میرا اضطراب کم ہونے کی بجائے کچھ مزید ہی ہو گیا تھا۔ اب میرے سامنے دو راستے تھے ایک یہ کہ اپنی بات بیان کرنے کی کوشش کروں۔ اس صورت میں اپنی بے بضاعتی اور عدم قدرت کلام مانع آتے تھے۔ یہی سوچتا تھا کہ اس نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا! —— لہٰذا بولنے کا حشر معلوم۔ دوسرے یہ کہ خاموش رہوں۔ اس شکل میں بھی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ جماعت کے اندر رہوں۔ لیکن اس صورت میں اگر اب نہیں بولتا تو آئندہ کسی موقعہ پر بولنا غلط ہوگا۔ ہر شخص یہ معقول بات کہہ سکے گا کہ جہاں بولنے کا موقعہ تھا وہاں بولے نہیں اب کیوں فساد مچاتے ہو۔ دوسری یہ کہ جماعت کو خاموشی سے چھوڑ جاؤں۔ اس صورت میں بھی جماعت کا یہ الزام اور یہ حجت مجھ پر قائم ہو جاتی تھی کہ بغیر اختلاف کا اظہار کئے نکل جانا صحیح نہیں ہے! چنانچہ میں نے طے کیا کہ جو ہو سو ہو بہرحال اپنی بات ارکان کے سامنے رکھنے کی کوشش کروں گا!

اس خیال سے کہ اگر پہلے سے معلوم ہو جائے کہ مجھے کتنا وقت مل سکے گا تو اسی کے مطابق اپنی تقریر تیار کر سکوں۔ میں نے متعدد بار چودھری غلام محمد صاحب[1] سے جو اجتماع CONDUCT کر رہے تھے پوچھا کہ مجھے آپ کس قدر وقت دے سکیں گے جواب ہر بار یہی ملا کہ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا چنانچہ میں اپنی کوئی تقریر تیار نہ کر سکا۔ جو قرارداد میں نے مرتب کر کے دی اس کے لئے ایک طویل تقریر ہونی چاہیئے تھی لیکن کچھ معلوم نہیں تھا کہ وقت بھی مل سکے گا یا نہیں حتیٰ کہ عین وقت پر بھی تکرار ہی ہو رہی ہو کر رہی آدھ گھنٹے کے بحث مباحثے کے بعد مجھے

[1] اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں سے درگزر فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے!

غالباً ڈھائی گھنٹے دیئے گئے لیکن اب میں تھا اور میرا بیان۔ تقریر کوئی تیار نہ تھی! دوسری طرف اس آدھ گھنٹے کے بحث مباحثے نے مجھے پہلے ہی بدحواس کر دیا تھا۔ میں نے اپنا بیان پڑھنا شروع کیا تو پے بہ پے INTERRUPTIONS کی گئیں، درشت حتیٰ کہ ناشائستہ کلمات تک کہے گئے اور میں صبر کے گھونٹ پی پی کر اپنا بیان پڑھتا رہا۔ وقت معینہ کے اندر بیان ختم بھی نہ ہو پایا اور مجھے لاچار بیان کو ادھورا ہی چھوڑ دینا پڑا

میرے لئے اپنا یہ انجام تو قطعاً غیر متوقع نہ تھا۔ لیکن جماعت کے اراکین کی ایک بہت بڑی تعداد نے اس اجتماع کے موقع پر اور خصوصاً میری تقریر کے دوران جس اخلاق کا مظاہرہ کیا اس پر ضرور دکھ ہوا۔ اکابرین جماعت اس پر بھی ہر چیز کے بہتر پہلو ہی پر نظر رکھنے کے اصول کے تحت یہ کہہ کر مطمئن ہو جائیں کہ یہ سب کچھ دراصل اس لئے ہوا کہ اراکین جماعت کو اپنا مسلک کس قدر عزیز ہے کہ وہ کسی دوسری بات کو سن نہیں سکتے (جیسا کہ فی الواقع مولانا مودودی نے کہا بھی!) تو وہ ایسا کرنے کا اختیار رکھتے ہیں لیکن اگر عبرت حاصل کرنی ہو تو محض اس اجتماع کے موقع پر ارکان نے جس "اخلاق، ضبط اور نظم" کا ثبوت دیا ہے وہی جماعت کے تیزی سے روبہ انحطاط ہونے کی سب سے بڑی اور سب سے روشن دلیل ہے!

یہ سب کچھ اپنی جگہ ـــــ لیکن اس اجتماع کا ایک پہلو میرے لئے بہت تسکین اور تسلی کا موجب بھی ہوا اور وہ یہ کہ مولانا مودودی نے اس اجتماع میں ایک بہت پختہ اور مضبوط موقف FIRM STAND اختیار کیا اور پوری جرأت کے ساتھ اپنی بات کہی اور کھل کھلا اپنے آئندہ کے عزائم کا اظہار کیا۔ اس طرح اس مرتبہ قرارداد اور اس کے مفہوم میں وہ گنجلک پن اور ابہام باقی نہیں رہا جو دسمبر ۵۶ء کی شوریٰ کی قرارداد میں پایا جاتا تھا۔ مولانا نے جس مضبوطی اور ہمت کے ساتھ اپنی بات صاف صاف رکھ دی اس کے لئے میں ذاتی طور پر ان کا مشکور ہوں اس لئے کہ اس طرح میرے لئے معاملہ زیادہ صاف ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس اجتماع سے قبل جماعت کو ایک خالص قومی و سیاسی جماعت کا رول ادا کرنے کے لئے ابھی بہت سی منزلیں طے کرنی تھیں جنہیں وہ بصورت دیگر آہستہ آہستہ کچھ شرماتی کچھ کتراتی طے کرتی لیکن اس اجتماع میں اس نے ایک ہی زقند میں ان سب کو عبور کر لیا ہے۔

اسے میری کور چشمی اور نا فہمی پر مبنی قرار دیا جائے تو بھی مجھے اعتراض نہیں ہے لیکن واقعہ بہرحال یہی ہے کہ مجھے مولانا مودودی کی طویل تقریروں میں کوئی ایسی وزنی دلیل نہ ملی جس کی بنا پر میں اپنے موقف کو تبدیل کر سکتا۔ یہاں مجھے یہ کہنے میں بھی باک نہیں ہے کہ اس کے برعکس میں نے یہ محسوس کیا کہ خود مولانا موصوف بھی اپنے موقف پر پورے طور سے مطمئن نہیں ہیں بلکہ اس غلط احساس کی بنا پر کہ "اب واپس لوٹ کر جانے کا امکان نہیں ہے لہٰذا آگے ہی بڑھنا چاہیئے" اپنے موقف کے لئے دلائل لا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اجتماع میں صاف صاف اعلان کیا کہ "مولانا کی تقریر اور اس میں بیان شدہ دلائل سے میرا قطعاً

اطمینان نہیں ہوتا ——— البتہ میں جماعت کا رکن رہوں گا"!

جماعت کی رکنیت جاری رکھنے کا فیصلہ میں نے مندرجہ ذیل تین وجوہ سے کیا تھا:

۱: یہ کہ میں اس "گرما گرم" ماحول میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا جس میں خاص طور پر ایک بہت سخت MENTAL TORTURE کی سی کیفیت میں گرفتار رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ پھر ٹھنڈے ماحول میں از سر نو اپنے موقف کا بھی جائزہ لوں اور مولانا مودودی کے دلائل کا بھی مطالعہ کروں ——— شاید مجھے کوئی روشنی مل جائے!

۲: یہ کہ میں ذرا "اپنے شیطان" کا بھی جائزہ لے لینا چاہتا تھا جیسا کہ خود مولانا مودودی نے فرمایا تھا (اور صحیح فرمایا تھا) کہ ہر شخص کو اپنے شیطان سے باخبر رہنا چاہیئے۔

۳: تیسرے یہ کہ ایک مجبوری بھی میرے سامنے تھی کہ جماعت کو چھوڑ کر کوئی اور "جائے پناہ" بھی اپنے دین اور ایمان کو بچانے کی نظر نہ آتی تھی اس وجہ سے میں چاہتا تھا کہ حتی الامکان اس جائے پناہ کو ہاتھ سے نہ کھوؤں!

اجتماع ماچھی گوٹھ کے بعد سے آج تک ... میں مسلسل ان مسائل پر غور کرتا رہا ہوں۔ میں نے ہر معاملہ میں دونوں پہلوؤں کو نگاہ میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ خود اپنے آپ سے بے حد بدظن ہو کر بھی معاملات پر غور کیا ہے۔ کتنی ہی بار میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مجھے جماعت سے مستعفی ہو جانا چاہیئے لیکن میں پھر رک جاتا رہا بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ رمضان کے آخری عشرہ میں سے جتنے دن بھی مجھے مل سکے ان میں اعتکاف کروں گا اور یکسوئی کے ساتھ اور اللہ سے رہنمائی کی دعا کرتے ہوئے کوئی فیصلہ کروں گا۔

- جہاں تک میرے اصولی موقف کا تعلق ہے جتنا بھی میں نے سوچا اسی قدر اسے صحیح پایا اور جتنا غور کیا اسی قدر اس کی صحت پر میرا یقین بڑھتا چلا گیا۔ میں نے اجتماع سے قبل ترجمان کے اشارات اور ایک خاص مضمون دو خطوط اور ان کا جواب بھی دیکھے۔ مولانا کی تقریروں کے NOTES بھی دوبارہ دیکھے چودھری محمد اکبر صاحب نے جو دلائل میرے سامنے رکھے ان پر بھی غور کیا لیکن مجھے ان میں کہیں روشنی نہ ملی اور جو رائے میں نے اپنے مفصل بیان میں تحریر کی ہے، میں اس میں کوئی تبدیلی نہ کر سکا۔
- جہاں تک "اپنے شیطان" کا تعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ مجھے پہلے بھی اس کا احساس تھا لیکن ماچھی گوٹھ میں مولانا مودودی کے اس طرف توجہ دلانے اور پھر ایک نجی ملاقات میں جناب نعیم صدیقی صاحب کے بھی اس طرف متوجہ کرنے پر میں نے اس معاملہ میں اپنی حد تک پوری باریکی سے جائزہ لیا اور خدا گواہ ہے کہ اپنے آپ سے بدظن ہو کر سوچ بچار کیا۔

۱: میں نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ خیالات میرے دل میں کسی اور نے ڈال دیئے ہوں اور میں کسی اور کا آلہ کار بن گیا ہوں ——— تو مجھے اطمینان ہوا کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ سب کچھ میری ذاتی سوچ بچار

کا نتیجہ تھا۔ اپنے بیان کے تحریر کرنے تک اس معاملہ میں میری گفتگو نہ کبھی سعید ملک صاحب سے ہوئی اور نہ ہی کسی اور ایسے نمایاں شخص سے جو اختلافی ذہن رکھتا ہو۔ صرف لغاری صاحب سے گفتگو ہوئی، وہ بھی اس وقت جبکہ میں اپنی آراء بنا چکا تھا۔ ان سے مل کر مجھے اپنی بات پر انشراح صدر تو ضرور ہوا، لیکن کسی نئی بات کا اضافہ نہیں ہوا۔ رہا مقامی طور پر تو یہاں یہ تو ضرور ہوا ہوگا کہ میں نے دوسروں کو تھوڑا بہت متاثر کیا ہو لیکن کسی اور سے ایسا کوئی تاثر لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲- پھر میں نے سوچا کہ میں کہیں کسی آزمائش سے جی چرا کر تو نہیں بھاگ رہا ہوں —— تو اس سلسلے میں بھی مجھے اطمینان ہی ہوا کہ اوّل تو اس وقت جبکہ میں استعفیٰ دے رہا ہوں ایسی کوئی بڑی آزمائش درپیش ہی نہیں ہے۔ پھر جو چھوٹے موٹے امتحانات اس راہ میں پیش آئے ہیں ان کے مواقع پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہی شامل حال رہا ہے اور کبھی بد دلی نزدیک نہیں آسکی ہے۔ زمانہ طالب علمی کا اختتام اور عملی زندگی کی ابتدا ایک نوجوان شخص کے لئے کئی ایک چھوٹی بڑی آزمائشیں لے کر آتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس موقع پر میں نے اپنے قدموں میں کوئی کمزوری محسوس نہ کی اور پورے ثبات کے ساتھ جمعیت کی رکنیت سے جماعت کی رکنیت کی طرف منتقل ہو گیا۔ اجتماع ماچھی گوٹھ کا MENTAL TORTURE بھی میرے لئے ایک امتحان تھا لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس موقع پر بھی محض جذبات میں میں نے کوئی اقدام نہیں کیا اور اس کے بعد بھی سوا دو ماہ تک مسلسل سوچ بچار کرتا رہا ہوں۔

۳- پھر میں نے اس اعتبار سے اپنا جائزہ لیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ (مولانا مودودی کے الفاظ میں) پہلے ضعفِ ارادہ پیدا ہوا ہو اور پھر اُس نے یہ مرکب شکل اختیار کر لی ہو تو مجھے اطمینان ہوا کہ کم از کم میرے معاملہ میں تو یہ صورت حال بھی ہرگز موجود نہیں ہے۔ میں اپنے بیان کی تحریر کے وقت تک جماعت کا تمام کام پوری تندہی اور سرگرمی سے کرتا رہا ہوں اور یہ صورت ہرگز نہیں ہوئی کہ پہلے اعضا اور جوڑ بند ڈھیلے پڑے ہوں اور بعد میں میں نے اپنے تعطّل کی وجہ جواز کے طور پر یہ سارا فلسفہ گھڑا ہو —— بلکہ مجھے کم از کم اپنے آس پاس کی حد تک تو معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ جو لوگ سست پڑ گئے ہیں اور جن میں مقصد اور تحریک کے ساتھ عملی دلچسپی کم ہو گئی ہے وہ تو ایک نفسیاتی سے سہارے کے طور پر جماعت کی رکنیت کو چمٹا چمٹا کر سینے سے لگاتے ہیں اور اپنا حال دیکھ کر پھر کسی عام رکن پر بھی تنقید کی جرأت نہیں کرتے کجا کہ پوری جماعت اور اس کی قیادت پر!

۴- ایک یہ خدشہ بھی میرے سامنے پیش کیا گیا کہ شاید جماعت کی صفوں میں "ترقی درجات" نہ ملنے کے باعث تیرے نفس نے ایک چوٹ کھائی ہوئی خودی کی مانند یہ سارا زہر اگلا ہے!! —— میں نے اس پر بھی غور کیا تو مجھے اپنے بارے میں اس کا بھی کوئی امکان نظر نہ آیا اس لئے کہ جماعتی صفوں میں جلد ترقی کرنی ہوتی تو مجھے اس کا موقع ملا تھا جبکہ وقت کے امیر جماعت (مولانا امین احسن صاحب) نے مجھے اپنی تعلیم سے

قراغت کے بعد یہ مشورہ دیا تھا کہ میں لاہور ہی میں رہوں اور "اپنی ساری امنگیں سیاست کے میدان میں پوری کروں" لیکن میں نے اس مشورہ کو رد کر کے منٹگمری میں سکونت اختیار کی! پھر سیدھی بات یہ بھی ہے کہ جماعت میں "ترقی درجات" ہاں میں ہاں ملانے اور مکھی پر مکھی مارنے سے ملتی ہے نہ کہ الٹی تنقیدیں کرنے سے!!

شیطان کے ان تمام ممکنہ واروں کا میں نے جائزہ لیا تو مجھے معلوم ہوا کہ ان میں سے کوئی مجھ پر کارگر نہیں ہوا۔ میں نے اپنے امکانی حد تک اپنے ذہن کے ایک ایک کونے کو ٹٹولا ہے لیکن شیطان کی کوئی کمین گاہ تلاش نہ کر سکا۔ اب ایک آخری امکان ہے اور وہ یہ ہے کہ شیطان میرے ذہن کے ریشے ریشے میں اور میرے خون کے ایک ایک خلیے میں اس طرح سرایت کر چکا ہو کہ اس نے مجھے اس قابل ہی نہ چھوڑا ہو کہ میں اپنے دل و دماغ میں اس کا سراغ لگا سکوں ——— تو اگر ایسی کیفیت ہے تو بھی جماعت کی رکنیت کے جاری رکھنے کا تو بہرحال کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہی ہو چکا ہے تو ظاہر ہے کہ مجھ سے کوئی خیر تو بن ہی نہیں آسکتا اگر جماعت میں رہوں گا تو فتنہ انگیزی کروں گا اور فساد پھیلاؤں گا۔

● اجتماع کے بعد کے ان سوا دو ماہ میں میں نے یہ محسوس کیا کہ نہ میں جماعت کے کسی کام کا رہ گیا ہوں اور نہ جماعت میں سے مجھے اب کوئی دینی فائدہ پہنچ سکتا ہے بلکہ اب میرا جماعت کے اندر رہنا خود میرے لئے بھی نقصان دہ ہے اور جماعت کے لئے بھی۔ جماعت کے اجتماعی ذہن کے خلاف ایک ذہن لے کر جماعت کے اندر رہنا اپنی حیثیت کے مطابق چھوٹے یا بڑے پیمانے پر جماعت میں کش مکش کو باقی رکھنا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ جماعت کے لئے کسی طرح مفید نہیں ہے کوئی سیاسی جماعت جبکہ ابھی وہ خارجی کش مکش کے دور میں ہو اگر اندرونی طور پر بھی کش مکش میں مبتلا ہو جائے تو یہ اس کے حق میں برا ہی ہے اچھا کسی طرح نہیں ہے لہٰذا میرا وجود جماعت کے لئے کسی حیثیت سے مفید نہیں ہے بلکہ مضر ہے۔ دوسری طرف اب جماعت کی رکنیت سے میرے اندر "نفاق" کی سی کیفیت پیدا ہو رہی ہے! ایک چیز کو غلط اور ناحق سمجھتے ہوئے بھی میں مجبور ہوں کہ پبلک میں جماعت کے رکن کی حیثیت سے اس کی حمایت کروں اور یہ چیز اب میرے لئے ناممکن بنتی چلی جا رہی ہے!!

مندرجہ بالا امور پر غور و فکر کے بعد میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جماعت سے مستعفی ہو جاؤں، لہٰذا میرا استعفیٰ حاضر ہے!!

جماعت کے ساتھ میرا جذباتی اور غیر شعوری تعلق ۱۹۴۷ء سے، شعوری ہمدردی کا تعلق ۱۹۵۱ء سے، (جبکہ میں نے جمعیت کی رکنیت اختیار کی) اور باقاعدہ رکنیت کا تعلق گزشتہ سوا دو سال سے ہے۔ اس دس سال کے عرصہ میں میری پوری دنیا جماعت ہی کے چھوٹے سے حلقہ میں محدود رہی ہے۔ تعلقات اور دوستیاں، محبتیں اور الفتیں، حتیٰ کہ رشتہ داریاں تک اسی حلقہ میں محدود رہیں۔ بیٹھنا اٹھنا بھی اسی میں رہا اور سننا بولنا بھی

اسی میں رہا۔ اب دفعتہً اس حلقہ سے نکلتے ہوئے دل و دماغ سخت صدمہ محسوس کر رہے ہیں۔ کتنے ہی بزرگوں سے مجھے والہانہ عقیدت ہے اور کتنے ہی ساتھیوں سے بے پناہ محبت ہے۔ جب میں سوچتا ہوں آج کے بعد شاید میرے بزرگ میری عقیدت کی قدر نہ کریں اور میرے دوست میری محبت پر اعتماد نہ کریں تو دل اندر سے پگھلا جاتا ہے۔ پھر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جماعت کے بہت سے بزرگ مجھ سے بزرگانہ شفقت کا اور کتنے ہی ارکان و متفق مجھ سے حقیقی محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ جب سوچتا ہوں کہ آج اپنے اس اقدام سے میں نہ معلوم کتنوں کے جذبات کو مجروح کروں گا تو اپنے ہی آپ میں ایک ندامت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود اس اقدام پہ مجبوراً اس لئے آمادہ ہو گیا ہوں کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا!

میں نے جب جماعت کی رکنیت اختیار کی تھی تو اس وقت بھی اسے کوئی بچوں کا کھیل نہ سمجھا تھا اور آج جبکہ اسے ترک کر رہا ہوں تو یہ اقدام بھی بغیر سوچ بچار کے کسی جذباتی کیفیت میں نہیں کر رہا۔ اپنے بیان جائزہ کمیٹی کے تحریر کرنے کے ایک سال قبل سے میں ذہنی کش مکش میں مبتلا ہوں اور اس واقعہ کو بھی آج چھ ماہ سے اوپر کا عرصہ ہو چکا ہے جس میں میں نے جذبات سے خالی ذہن کے ساتھ بھی اور جذبات کی رفاقت کے ساتھ بھی دونوں ہی طرح مسلسل غور و فکر کیا ہے اور آخر میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی کی دعا کرتے ہوئے ایک فیصلہ کیا ہے۔ جب اندر آیا تھا تو "رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا" کے ساتھ "رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ" کی دعا کرتا ہوا آیا تھا اور آج جب باہر جا رہا ہوں تو اپنے اللہ سے "أَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ" کی دعا کرتا ہوا جا رہا ہوں۔

جن حالات اور کیفیات سے گزر کر میں نے جماعت کی رکنیت سے تعلق منقطع کیا ہے وہ میں نے اپنی حد تک صحیح صحیح اور صاف صاف بیان کر دیئے ہیں اس کے بعد بھی کسی "نفسیاتی تجزیے" کی ضرورت ہو تو جماعت کے کسی اہل قلم کو ماشاء اللہ اس میں مہارت تامہ حاصل ہی ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ ایسے کسی تجزیے سے کوئی فائدہ ہی اٹھا سکوں۔

آخر میں دست بدعا ہوں اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِيرِنَا وَكَبِيرِنَا وَذَكَرِنَا وَأُنْثَانَا۔ اَللّٰهُمَّ مَنْ أَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَأَحْيِهِ عَلَى الْإِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا فَتَوَفَّهُ عَلَى الْإِيمَانِ۔

خاکسار اسرار احمد

تحریر ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ مطابق اپریل ۱۹۵۷ء بحالت اعتکاف بعد عصر"

ضمیمۂ سوم

۱: بیان کی تحریر سے اصل مقصد

"..... میری رائے میں جماعت اسلامی کی اصل تحریک ۴۷ء میں حقیقتاً اور اصولاً ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد جماعت اسلامی کی قومی جد وجہد کے ساتھ ساتھ اس ابتدائی تحریک کے کچھ اثرات ایک عرصے تک برسرکار رہے ہیں لیکن اب وہ بھی دم توڑ چکے ہیں۔ اب اس تحریک میں سے اگر کچھ باقی ہے تو وہ ان چند نیک دل مخلص لوگوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جنہیں اس اصل تحریک کی دعوت نے کھینچا تھا اور جو ابھی تک جماعت اسلامی کی قومی تحریک کا دامن اسی اصل تحریک اسلامی کے مغالطے میں تھامے چلے آ رہے ہیں اور اب بھی اگرچہ ان کی اکثریت کچھ کھٹک محسوس کر رہی ہے لیکن سوائے چند کے کوئی نہیں جانتا کہ جسے سینے سے لگائے پھر رہے ہیں وہ ایک ایسی بے جان نعش ہے جس کی روح کبھی کی پرواز کر چکی ہے ..... !"

مجھے اب مستقبل کے بارے میں بھی کوئی امید ہے تو وہ صرف ان کے خلوص سے ہے کہ اگر آج بھی ان پر واضح ہو جائے کہ فلاں جگہ سے ہم غلط موڑ مڑ آئے ہیں اور اب غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ تو وہ آگے بڑھنے کی دھن میں غلط راستے ہی پر چلتے رہنے کو گوارا کرنے کی بجائے واپس مڑ کر صحیح راستے کو اختیار کرنے میں پس و پیش سے کام نہ لیں گے۔ چاہے اس طرح انہیں ایک طویل مسافت کو دوبارہ قطع کر کے سفر کو تقریباً از سر نو ہی شروع کرنا پڑے۔

اور اس کا امکان اگر کوئی ہے تو صرف اس طرح کہ پچھلی غلطیوں کا بے لاگ جائزہ لیا جائے ایک ایک غلطی کا واضح اور شعوری اعتراف ہو اور اس کے جو جو اثرات جہاں جہاں مترتب ہوتے ہیں ان کو ڈھونڈ کر اور کرید کرید کر سامنے لایا جائے — اور اسی کی ایک حقیر سی کوشش میں نے اس طویل بیان میں کی ہے — اور اگر یہ کوشش اس اصل تحریک تجدید و احیائے دین کے احیا میں کچھ بھی مفید ثابت ہو سکے جو جماعت اسلامی کے زیر سرکردگی ۴۱ء سے ۴۷ء تک ہندوستان میں جاری رہی تھی تو میں سمجھوں گا کہ یہی میری نجات

کے لئے کافی ہے ــــ رَبَّنا تقبل مِنّا اِنّکَ انت السمیع العلیم و تب علینا اِنّکَ انت التواب الرَّحِیم ۔"

(تحریک جماعت اسلامی صفحات ۲۰۳ و ۲۰۴)

۲۔ اشاعت میں تاخیر کا سبب

"آج سے تقریباً دس سال قبل کی ایک تحریر کو اشاعت عام کے لئے پیش کرتے ہوئے اس سوال کا جواب فطری طور پر میرے ذمّے ہے کہ آج تک میں نے اس کو کیوں شائع نہ کیا اور اب کیوں کر رہا ہوں؟

اب سے پہلے اس تحریر کو شائع نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ اگرچہ یہ تحریر برّصغیر ہند و پاک کی ایک معروف دینی و سیاسی جماعت کے بارے میں ایک تاریخی مطالعہ ہونے کے اعتبار سے عمومی دلچسپی کی حامل بھی ہے۔ لیکن اس کے اصل مخاطب جماعت اسلامی کے متعلقین ہی ہیں اور جماعت کے حلقے میں متذکرہ بالا جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے کے فوراً بعد جو ہنگامی صورت حال پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں نہ صرف پوری جائزہ کمیٹی بلکہ مولانا امین احسن اصلاحی اور کم و بیش پچاس ساٹھ ارکان جماعت، جماعت سے علیحدہ ہوئے اور پھر الزامات اور ان کے جوابات کا جو تلخ سلسلہ شروع ہوا اس نے جماعت کی اندرونی اور اس کے قریب کی فضا کو اس درجہ مکدّر کر دیا تھا کہ اس میں اس بات کا سرے سے کوئی امکان باقی نہیں رہ گیا تھا کہ کسی بھی بات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جاسکے۔ یہ سلسلہ پورے شدّ و مد کے ساتھ مسلسل کئی سال جاری رہا اور اس کے نتیجے میں جماعت سے متعلق اور اس سے دلی ہمدردی رکھنے والے حضرات کے ذہنوں میں جماعتی عصبیت اس درجہ راسخ ہو گئی کہ ان کے قلوب و اذہان نے جماعت سے نکلے ہوئے تو کجا جماعت سے باہر کے کسی بھی شخص کی بات سن کر اس پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔

اس معاملے میں سارا الزام میں جماعت کے متعلقین ہی کو نہیں دیتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی ایک غالب اکثریت کے سامنے نہ صرف یہ کہ اختلاف کی صحیح نوعیت اپنی اصل صورت میں کبھی نہیں آئی۔ بلکہ اہل اختلاف نے اظہارِ اختلاف کا جو طریقہ اختیار کیا اس کی بھی جو صورت ان کے سامنے آئی وہ بظاہر بہت بھونڈی اور ناقابل فہم تھی بنتیجۃً جماعتی عصبیت کی وہ کچی دیوار جو فطری طور پر پہلے ہی دلوں میں موجود تھی تعصب کی ایک پختہ فصیل میں تبدیل ہو گئی۔

ان حالات میں اس تحریر کی اشاعت سے کسی مثبت اور تعمیری فائدے کے حاصل ہونے کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی اور اس کے شائع کرنے سے اس کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوتا کہ اس کے مصنف کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا اور اس کی بھڑاس نکل جاتی لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا بے پایاں احسان ہے اس بندۂ ضعیف پر جس کا شکر وہ کسی طرح ادا نہیں کر سکتا کہ محض یہ منفی محرک اسے اس کی اشاعت پر آمادہ نہ کر سکا۔ اس دس سال کے عرصے میں راقم الحروف نے اپنی اس تحریر کو متعدد بار از اوّل تا آخر

پڑھا جس سے اس کی صحت پہ اس کا یقین مزید پختہ ہی ہوتا چلا گیا۔ کئی بار دل میں اس کی اشاعت کا خیال بھی پیدا ہوا لیکن صرف اس وجہ سے کہ اس سے کوئی تعمیری اور مثبت فائدہ نظر نہ آیا اس کی اشاعت کو ملتوی کیا جاتا رہا۔

ادھر دو تین سال سے فضا قدرے پُرسکون ہوئی ہے اور غیظ و غضب کی وہ آگ ذرا ٹھنڈی ہوئی ہے جو تلخ الزامات اور ان کے تلخ تر جوابات سے دلوں میں بھڑکی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "نکلنے والے" اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے ہیں اور "رہنے والے" اپنے مسائل میں مشغول اور اگرچہ اب بھی طنز و تعریض کے اِکّا دکّا تیر چلتے رہتے ہیں۔ تاہم یہ سب کچھ اب "الشاذ کالمعدوم" کے حکم میں ہے ورنہ عام طور پہ فضا میں وہ تکدر باقی نہیں رہا جو کبھی تھا اور نتیجتہً اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ جماعت سے متعلق حضرات میری اس تحریر کو کسی قدر کھلے دل سے پڑھ سکیں گے —— اسی امید پہ میں اب اس تحریر کو اشاعت عام کے لئے پیش کر رہا ہوں۔"

(دیباچہ تحریک جماعت اسلامی صفحات ۷ تا ۱۰)

۳۔ کتاب کی اشاعت سے اصل مقصود

"تحریک جماعت اسلامی کا دورِ اوّل" یعنی اس کتاب کا باب دوم اس کا وہ اصل حصہ ہے جس کی اشاعت کے لئے اس پوری کتاب کو شائع کیا جا رہا ہے۔

اس تحریک کے بنیادی نظریات اور اس کے اساسی تصوّرات کا جو مرقع میں نے پیش کیا ہے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے جزوی اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اس تحریک کے افکار و نظریات کی صحیح عکاسی نہیں ہے! جماعت اسلامی کی یہ شبیہہ میرے ذہن و وجدان کے داخلی پردوں پہ تو منقش ہے ہی اس کی صحت پہ خارجی شواہد بھی مجھے اتنے ملے ہیں کہ اس پر میرا یقین انتہائی پختہ ہوتا چلا گیا۔ جماعت اسلامی سے عملی یا ذہنی دلچسپی رکھنے والے جس شخص نے اسے پڑھا اس نے اس امر کی گواہی دی کہ واقعتہً جماعت اسلامی کی صحیح تصویر یہی ہے حتّٰی کہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے جو نومبر، دسمبر ۵۶ء میں مسلسل دو ہفتے جاری رہا تھا اور جس میں جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پہ غور ہوا تھا، جب یہ فرمایا کہ "میں ہر رکن شوریٰ کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس بیان کو ضرور پڑھے، اس کے مصنف نے ہماری ہی تحریروں سے مرتب کر کے ایک آئینہ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے جس میں ہم اپنی صورت دیکھ سکتے ہیں"، تو میرے نزدیک یہ جماعت اسلامی کی دعوت اور اس کے طریق کار کے بارے میں میرے پیش کردہ تصوّر کی صحت پہ آخری خارجی دلیل ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اس مفصل بیان کے تحریر کرنے سے بھی مقصود یہی تھا اور اب اس کی اشاعت سے بھی مطلوب یہی ہے کہ کسی طرح اس تحریک کی تجدید اور اس کے احیا کی صورت پیدا ہو جیسے لے کر جماعت اسلامی اٹھی تھی لیکن جسے اس نے تاریخ کی ایک ہی کروٹ پر پیٹھ کے بوجھ کی طرح اتار پھینکا۔

میرے نزدیک نہ مختلف مسلمان ملکوں کو جغرافیائی و وطنی وحدت مان کر ان کے بقاء و استحکام کی سعی و جہد کفر ہے اور نہ ہی مسلمان قوم کو ایک وحدت ملی مان کر اس کی فلاح و بہبود کی کوشش دائرہ اسلام سے خارج۔ لیکن تمام مقاصد میں سب سے اعلیٰ مقصد اور تمام کوششوں میں سب سے برتر کوشش اعلائے کلمۃ اللہ کا مقصد اور شہادتِ حق علی الناس کی کوشش ہے۔ یہ بات جس طرح آج سے پہلے صحیح تھی اسی طرح آج بھی حق ہے کہ امتِ مسلمہ کی غرض تاسیس ہی یہ ہے کہ "كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ"[1] اور كَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا[2] اور آج جبکہ یہ امت بحیثیت مجموعی اپنے اس اصل فرض منصبی کو نہ صرف یہ کہ ادا نہیں کر رہی بلکہ عملاً اس کے بالکل برعکس کوششوں میں مصروف ہے۔ اس امت میں سے صحیح راہ پر وہی ہیں جو کم از کم وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ[3] کے مصداق بن جائیں۔

میرے نزدیک اگر آج سے پچیس سال قبل مسلمانان ہند تقریباً مجتمع ہو کر اپنے قومی و ملی تشخص کے تحفظ اور غیر مسلم اقوام کے معاشی و تہذیبی تسلط سے بچاؤ کی فکر کر رہے تھے اور ان مقاصد کے لئے حصول پاکستان کی جدّ و جہد میں مصروف تھے تو نہ وہ کفر تھا اور نہ ہی اگر آج جماعت اسلامی نظریۂ پاکستان کی سب سے بڑی علمبردار بن کر تحریک مسلم لیگ کی وراثت حاصل کرنے کی سعی کر رہی ہے تو یہ دائرہ اسلام سے خارج ہو گئی ہے ——— لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ جبکہ قومی و ملی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنے والے نہ پہلے کم تھے نہ آج مفقود ہیں وہاں اس جگہ کو پُر کرنے والا کوئی نہیں رہا جو جماعت اسلامی نے اپنے انتقال موقف سے خالی کی ہے

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی و امّی کی حیاتِ طیبہ میں چند مواقع ایسے ملتے ہیں جن پر

---

[1] سورۂ آل عمران رکوع ۱۷: تم ہو بہتر سب امتوں سے جو بھیجی گئی عالم میں حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر"

[2] سورہ بقرہ رکوع ۱۷: اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا" (ترجمہ شیخ الہند) [3] سورۂ آل عمران رکوع ۱۱: "اور چاہیئے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کریں برائی سے اور وہی پہنچے اپنی مراد کو" (ترجمہ شیخ الہند)

حضورؐ کے قلب مبارک میں انسانی جذبات بے اختیار امڈے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں کا ایک موقع وہ ہے جب حضورؐ غزوہ اُحد سے واپس مدینہ منورہ تشریف لائے اور آپ نے دیکھا کہ پوری بستی عورتوں کے نوحے اور بین کی آواز سے گونج رہی ہے اس وقت حضورؐ کو بے اختیار اپنے عزیز اور محبوب چچا اور بچپن کے رفیق اور ساتھی بلکہ رضاعی بھائی حضرت حمزہؓ یاد آئے اور وفورِ جذبات میں یہ الفاظ آپ کی زبان مبارک سے نکل گئے کہ "اما حمزۃُ فلا بواکی لہٗ !!" ——— "آہ! حمزہؓ کا رونے والا کوئی نہیں!" بالکل یہی حال آج اس دین کا ہے جو بڑی شان سے "جزیرہ نمائے عرب سے نکلا تھا لیکن آج ایسا "غریب الغربا" بن گیا ہے کہ اس کے لئے رونے والا کوئی نہ رہا۔ فرمان نبوی "بَدَأَ الاِسْلَامُ غَرِیبًا وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَأَ"[1] تو مجسّم اور متشکل نگاہوں کے سامنے موجود ہے لیکن آنکھیں ان غربا کو ترس رہی ہیں جو اس غربت اور اجنبیّت کے دور میں اس غریب کے ہمدرد و مونس و غم خوار ہوں! ——— اور "فَطُوبٰی لِلْغُرَبَاءِ" کی نوید کے حقدار بن سکیں۔ یہ دین بیگانوں کی ناخوشی کا کیا شکوہ کرے جبکہ اس کے اپنوں کی خفگی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے قومی، ملکی اور ملی مسائل میں ایسے گم ہیں کہ انہیں اس کی ہمدردی تک کا وقت تک نہیں ملتا اور اگر کبھی ان میں سے چند راہ رو چند قدم اس کے ساتھ چلتے بھی ہیں تو جلد ہی تھک ہار کر بیٹھ رہتے ہیں اور یہ پھر ویسے کا ویسا تنہا رہ جاتا ہے !!

اگر میری اس تحریر کی اشاعت سے اس "غریب الغرباء" کے پرانے رفقائے سفر میں سے کچھ اس کی رفاقت پر از سرِ نو کمرِ ہمت کس لیں تو بس یہی اس کی اشاعت سے مطلوب ہے !

(دیباچہ تحریکِ جماعت اسلامی صفحہ ۱۴ تا ۱۷)

۴۔ "تحریکِ جماعتِ اسلامی" پر تبصرے اور اظہارِ خیال

نمونہ مشتے از خروارے

ا: اخبارات و جرائد سے

ا: روزنامہ "وفاق" لاہور "زیرِ نظر کتاب جماعت اسلامی کے اپنے ہی بیان کردہ اصولوں اور نظریات سے انحراف کی ایک دلخراش مگر مستند اور مدلّل داستان ہے جسے جماعت اسلامی کے لٹریچر کا

---

[1] حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "اسلام کی ابتداء غربت میں ہوئی اور جلد ہی یہ دوبارہ اجنبی ہو جائے گا ——— تو مبارکباد ہو اجنبیوں کو!"

تحقیقی مطالعہ اور جماعت اسلامی کی سرگرمیوں کا قریبی جائزہ لینے کے بعد اس جماعت ہی کے ایک ممتاز اور ذہین کارکن ڈاکٹر اسرار احمد نے مرتب کیا ہے اور دو اور دو چار کی طرح المناک حقیقت واضح کر دی ہے کہ جماعت اسلامی کی موجودہ سرگرمیاں اُن بنیادی نظریات اور اساسی تصورات سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں جن پر اس جماعت نے ایک ہمہ گیر اسلامی تحریک کا بیڑا اٹھایا تھا ....

میری یہ دیانت دارانہ رائے ہے کہ اگر جماعت اسلامی کے متفقین تعصب سے کام لئے بغیر اس کتاب کے آئینے میں اپنی موجودہ سرگرمیوں کا جائزہ لینا چاہیں تو انہیں ہر وہ داغ اور دھبہ صاف دکھائی دے سکتا ہے جو جماعت اسلامی کے شفاف چہرے کو مسخ کرنے کا باعث بن چکا ہے اور بعید نہیں کہ اُن کے اندر کا وہ انسان پھر جاگ اٹھے جو دینِ حق کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے میدان عمل میں کود تھا لیکن اب نادانستہ طور پر ہی سہی باطل کے پجاریوں کا شریک وسہیم بن چکا ہے ...."

(از قلم: مصطفیٰ صادق، مدیر 'وفاق')

۲: روزنامہ 'امروز' لاہور | "... مصنف کے بعض فیصلوں اور کچھ آراء سے اختلاف ہو سکتا ہے مگر وہ احباب بھی اس کے خلوص، دردمندی اور دیانت کا اعتراف کریں گے جو زیر تبصرہ کتاب میں ہدفِ تنقید بنے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے ذاتی وجوہ کی بنا پر یا بعض مخصوص مصلحتوں کی خاطر جماعت اسلامی سے قطع تعلق نہیں کیا ان کا اختلاف نظریاتی اور اصولی ہے اور ان کی یہ تصنیف بھی شاہد ہے کہ ذہنی طور پر وہ اب بھی جماعت اسلامی کے قریب ہیں اور اس کے رہنماؤں کا احترام کرتے ہیں مگر جماعت اسلامی کی سیاست سے بیزار ہیں ...."

۳: روزنامہ 'پاکستان ٹائمز' لاہور | اس کے تبصرے سے اقتباس اصل انگریزی عبارت میں کور کے اندرونی صفحے پر ملاحظہ فرمائیں

۴: ماہنامہ 'فاران' کراچی | "... ہمیں اللہ تعالیٰ کو ایک دن منہ دکھانا ہے۔ جناب ڈاکٹر اسرار احمد کے بارے میں ہم اس قسم کا سوءِ ظن اور بدگمانی نہیں رکھتے کہ صاحب موصوف نے جماعت اسلامی کے بعض دوسرے ناقدین کی طرح سرکار دربار میں رسوخ اور کسی قسم کی منفعت حاصل کرنے کی غرض سے یہ کتاب لکھی ہے۔ ان کا معاملہ دوسرے مصنفین اور ناقدین سے مختلف ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جماعت کے ارکان کی اصلاح کے لئے یہ کتاب تصنیف کی ہے اور بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ جماعت کے سابقہ اور حالیہ موقف کا جائزہ لیا ہے ....

.... کوئی شک نہیں اس کتاب میں بعض دلیلیں بھی خاصی قوی ہیں۔ جماعت کے ماضی و حال کا تجزیہ بھی بڑے سلیقے سے کیا گیا ہے اور لکھنے کا انداز بھی خوب ہے ...."

(از قلم ماہر القادری مدیر 'فاران')

[واضح رہے کہ جناب ماہر پاکستان میں جماعت اسلامی کے اہم 'سرپرستوں' اور مولانا مودودی کے مدح سراؤں اور ثنا خوانوں میں سے ہیں !]

۵ : ماہنامہ 'زندگی' رامپور یوپی انڈیا | پہلے جناب عروج قادری مدیر 'زندگی' کا حسب ذیل خط موصول ہوا :

"آپ کی کتاب 'تحریک جماعتِ اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ' ماہنامہ 'زندگی' میں تبصرے کے لئے نہیں آئی۔ ایک جلد یہاں آنی ضرور تھی مگر وہ ماہنامہ کے لئے نہ تھی۔ میں نے آپ کی کتاب پڑھی ہے اور اس سے متاثر ہوا ہوں۔ میں اس پر تبصرہ بھی کرنا چاہتا ہوں۔ تبصرے کے لئے اپنی کتاب ہمارے پاس بھیج دیں شکر گزار ہوں گا۔ امید ہے کہ ماہنامہ زندگی آپ کی نظر سے گزرتا رہتا ہوگا۔"

اور بعد ازاں ایک مفصل تبصرہ ان ہی کے قلم سے شائع ہوا، جس کے پہلے اور آخری پیراگراف درج ذیل ہیں :

"جناب ڈاکٹر اسرار احمدؐ صاحب کی یہ کتاب تبصرہ نگار نے بالاستیعاب پڑھی ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان سے باہر آنے جانے والے ارکان نے اس سے پہلے بھی جماعت اور اس کے سربراہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے یہ کتاب ان سب تحریروں میں متعدد پہلوؤں سے ممتاز ہے۔ اس کا پہلا امتیاز یہ ہے کہ اس میں دس سال پہلے تک کی جماعت اسلامی پاکستان کا ایک مکمل جائزہ بسبیدگی اور دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اس کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ فاضل مصنف نے جماعت اسلامی قبل از تقسیم ہند کے موقف کی مکمل تائید کی ہے۔ تیسرا امتیاز یہ ہے کہ جو زبان انہوں نے استعمال کی ہے اس میں جارحیت کم اور سوقیت بالکل نہیں ہے اور اس کا چوتھا امتیاز یہ ہے کہ مصنف جماعت اسلامی پاکستان کو پھر اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں جو تقسیم سے پہلے تھا اور خود اسی نصب العین کے حصول کے لئے کام کرنا چاہتے ہیں جسے انہوں نے پورے شعور کے ساتھ اختیار کیا تھا ....

... اس کتاب پر اپنا مختصر تبصرہ ختم کرتے ہوئے یہ بات پھر عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ جناب ڈاکٹر صاحب کو اپنی توجہ اس پر مرکوز نہ کرنی چاہیئے کہ جماعت اسلامی پاکستان کے ارکان پر 'انحراف' واضح ہو جائے بلکہ ان کو اپنی توجہ اس بات پر مرکوز کرنی چاہیئے کہ جو لوگ انحراف کو سمجھ کر باہر آچکے ہیں وہ ایک مرکز پر جمع ہو کر ایک جماعت بن جائیں اور اعلائے کلمۃ اللہ کا وہ کام انجام دیں جس کی محبت میں انہوں نے جماعت اسلامی پاکستان سے قطع تعلق کیا ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب اس میں کامیاب ہوگئے تو یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا ...."

[واضح رہے کہ ماہنامہ 'زندگی' کو جماعت اسلامی ہند سے وہی نسبت حاصل ہے جو ماہنامہ 'ترجمان القرآن' کو جماعت اسلامی پاکستان سے !]

ب : انفرادی خطوط سے

"... تازہ 'میثاق' ملا۔ آپ کی کتاب 'تحریک جماعت اسلامی' کا مطالعہ کرنے کی سبیل کیا ہو؟ ممکن ہو تو ایک نسخہ بھجوائیں۔ 'فاران' کے تبصرے کے بعد معلوم ہوا کہ کتاب جاندار ہے۔"

(مولانا جلیل احسن ندوی، اعظم گڑھ، انڈیا)

[واضح رہے کہ مولانا جماعت اسلامی ہند کے اہم رہنماؤں میں سے ہیں اور جماعت کے حلقوں میں ان کا انتخاب حدیث نبویؐ بہت مقبول ہے !]

"... میں نے آپ کی کتاب آتے ہی پڑھ ڈالی۔ میرے لئے سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ جس شخص کے ذہن و فکر پر کوئی دوسرے اثرات نہیں تھے جس کا تمام ذہنی شعور جماعت اسلامی کی گود ہی میں پلا بڑھا اور تمام تربیت اسی کے سانچے میں ہوئی۔ اس کا ذہن اس قابل ہوا کیسے کہ جماعت کی پالیسی سے اتنی جلدی بے اطمینانی محسوس کرنے لگے ! میرے خیال میں شاید اس کی کوئی دوسری مثال جماعت میں نہیں ہے اور آپ کی یہی خصوصیت اس کتاب کی سب سے بڑی اپیل ہے ..."

(مولانا عتیق الرحمٰن، مدیر ماہنامہ 'الفرقان' لکھنؤ)

"... جماعت اسلامی کے ماضی و حال کے تقابلی مطالعے سے یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہو کر ثابت ہو گئی کہ ؎

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے !"

(حکیم افتخار احمد تکمیلی، پیلی بھیت، بھارت)

"... آپ کی کتاب مل گئی تھی۔ میں نے اس کا کئی مرتبہ مطالعہ کیا۔ خوب لکھا ہے اور بہت ہی عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ اکثر مواد تو ایسا ہے گویا کہ آپ نے میرے دل کی بات ہی لکھی ہو ..."

(ڈاکٹر صاحبزادہ محمد انور (سابق مسلم سرحدی) ایم بی بی ایس۔ ڈی ڈی پشاور)

"... یہاں چند حضرات جماعت کے حلقہ متفقین و متاثرین میں سے ایسے ہیں جو جماعت سے اختلاف کے ابتدائی دور میں خاصی بحث و تمحیص کیا کرتے تھے۔ میری بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اب وہ آپ کی تحقیقی کتاب پڑھ کر اس موقف کو نہ صرف سمجھ گئے ہیں بلکہ قائل ہو گئے ہیں۔ 'میثاق' کا بھی یہ حضرات باقاعدہ مطالعہ کر رہے ہیں ..."

(سید شیر محمد شاہ، ایم اے بی ایڈ، پاکپتن)

"... اسی اثنا میں 'تحریک جماعت اسلامی' کا مطالعہ کیا۔ تقریباً وہ سب باتیں آپ نے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو جائزہ کمیٹی میں ہم لوگوں نے نوٹ کرائی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ باتیں ہماری ہیں، قلم آپ کا ہے اور آپ نے ہم سب کی بھرپور نمائندگی کی ہے ... یہ کتاب محض آپ کی نہیں ہے اور اس میں

'تحریک جماعت اسلامی'

پر روز نامۂ پاکستان ٹائمز ، لاہور کے تبصرے کا اول و آخر

"Many books have been written in recent times exposing the ideological and practical aspects of the politics of Jama'at-i-Islami. But the usual complaint about such studies has been that they start with a predisposed antipathy towards the movement, a pre-judgement that does not take into consideration the basis of appeal which the philosophy of Maudoodism holds for a large number of sincere, self-sacrificing and honest intellectuals in the country. A diatribe which instead of analysing, is merely an airing of pre-conceived notions about a potent political tendency, loses its case because of such pre-judgements. This is not a work in that category."

"Dr. Israr Ahmad writes with conviction, and his arguments based as they are on the self analysis of a partisan (on behalf of the Jama'at) are more forceful than any objective analysis carried out by a non-member could have been. If there is any bias in his writing it is in favour of the original aims and objects of this group. That is why this book can be regarded as the finest study of Jama'at-i-Islami apart from its value as a personal record of a disillusioned political worker."

'اسلام کی نشاۃ ثانیہ'

پر روز نامہ پاکستان ٹائمز بابت ۱۴ جون ۱۹۶۸ء میں شائع ہونے والے مقالے سے اقتباس

"The modern period in the history of Islam throughout the world has often been given the name of an Islamic Renaissance. Most movements in the Islamic world during the last hundred years, whether purely literary and scholastic or social and political, have set out with this one declared purpose—the purification and re-affirmation of Islam as a faith and a system of beliefs, as a society and as a polity."

".....Many official and unofficial, political and non-political agencies have recently been trying to issue calls and manifestoes for starting a renaissance movement in the thought of Islam. The most recent and by far the most interesting is a pamphlet by Dr. Israr Ahmad,..... This pamphlet, "Islam ki Nasha'at-e-Sania," is a very important document, and needs to be studied by all muslims, because it makes the attempt, rare in these days, to come to grips with the fundamental issue of our situation as Muslims in the modern world....."

Regd. No. L. 7360

Monthly "MEESAAQ" Lahore

Vol. 21 | SEPTEMBER 1974 | No. 9

جماعتِ اسلامی

● کن مقاصد کے تحت قائم ہوئی تھی؟
● آزادی سے قبل اس کے نظریات کیا تھے؟
● قیامِ پاکستان کے بعد اس نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا؟ اور
● اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

جماعت کے ماضی و حال کا ایک تاریخی تجزیہ جماعت کے سابق کارکن کے قلم سے

تحریکِ جماعتِ اسلامی

ایک تحقیقی مطالعہ

تالیف

ڈاکٹر اسرار احمد۔ ایم اے۔ ایم بی بی ایس

سابق ناظمِ اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان و امیر جماعت اسلامی منٹگمری

● ضخامت - ۲۳۶ صفحات ● سائز بڑا ● طباعت آفسٹ ● مجلد مع گردپوش
● قیمت - ۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

دارالاشاعت الاسلامیہ
کرشن نگر، لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور سے طلب فرمائیں!

پبلشر : محی الدین ، طابع : شیخ محمد اشرف مالک اشرف پریس ایبک روڈ ۔ لاہور
مقام اشاعت : ۱۲- افغانی روڈ ، سمن آباد ، لاہور (فون : ۶۸۲۳۵)